عرض احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

حالیہ انتخابات ۔ اُمید کا چراغ

قارئین میثاق پاکستان کے بقاء واستحکام کے ضمن میں میرے موقف سے بخوبی آگاہ ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آج سے تقریباً چار سال قبل میں نے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں شدید مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ چنانچہ قرآن آڈیٹوریم میں اس موضوع پر ایک خطاب بھی کیا تھا کہ ''کیا پاکستان کے خاتمے کی اُلٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟'' میری یہ مایوسی محض وہمی وخیالی نہ تھی بلکہ اس کی چند ٹھوس وجوہات تھیں۔

اوّلاً یہ کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست تھا' لیکن ہم نے اس کے نظریے کا حق ادا نہیں کیا اور یوں اسے ایک ناکام ریاست ثابت کر دکھایا۔ ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کی واحد وجہ جواز اسلام تھی۔ قائداعظم کے الفاظ میں ہم نے یہ خطہ زمین اس لیے حاصل کیا تھا کہ ہم دنیا کو اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا ایک نمونہ قائم کر کے دکھا سکیں' لیکن افسوس کہ قیامِ پاکستان کے ۶۰ سال بعد تک بھی اس کے مقصدِ قیام کی طرف بال برابر بھی پیش قدمی نہیں ہو سکی۔ اس ضمن میں بعض ادوار میں کچھ نیم دلانہ اقدامات ضرور ہوئے لیکن اسلام کے نظامِ عدل اجتماعی کے قیام کی منزل کی طرف ہم نے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا۔ چنانچہ اس اعتبار سے پاکستان اپنی وجہ جواز کھو بیٹھا۔

پھر یہ کہ عالمی حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو پاکستان کی اب وہ اہمیت نظر نہیں آتی جو کچھ عرصہ قبل تھی۔ افغانستان میں روس کے خلاف جنگ میں امریکہ ہمارا پشت پناہ تھا اور جب تک امریکہ کو ہماری ضرورت رہی وہ ہماری پیٹھ ٹھونکتا رہا۔ لیکن اب وہ چائنا کے گرد اپنا حصار تنگ کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے اُس کی نظر میں بھارت ہم سے بہتر کردار ادا کر سکتا ہے' لہٰذا اب امریکہ بھارت کی زیادہ خوشامد کر رہا ہے اور اسے بہت زیادہ امداد دے رہا ہے۔ ہماری حیثیت تو اب نام نہاد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ کے ایک مہرے کی ہے اور وہ خود ہمارے ہاتھوں ہمارے ہی شمالی علاقہ جات میں نام نہاد اسلامی شدت پسندی اور اسلامی انتہا پسندی کا خاتمہ کروانا چاہتا ہے۔ ادھر نیٹو فورسز کو حکم دے دیا گیا ہے کہ پاکستان کے

حالات خراب ہونے کی صورت میں امن وامان قائم کرنے کی خاطر پاکستان میں داخل ہونے کے لیے تیار رہیں۔ دوسری طرف بھارت نے اپنی مسلح افواج کو پڑوسی ملک میں قیامِ امن کی خاطر دخل اندازی کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔ان حالات میں اس بات کا خدشہ ہے کہ ہماری مہلت عمل ختم ہو چکی ہو اور ہماری بداعمالیوں کی پاداش میں موجودہ پاکستان بھی مشرقی پاکستان کی طرح اپنا وجود کھو بیٹھے۔

پاکستان کے حالات سے مایوسی کی ایک وجہ پاکستانی قوم کا یہ طرزِعمل بھی تھا کہ اُس نے ہر آمر کو خوش آمدید کہا اور اس اعتبار سے اپنے آپ کو ایک مُردہ قوم ثابت کیا۔لیکن گزشتہ سال چیف جسٹس آف پاکستان نے جو قدم اٹھایا اور ان کی برخاستگی پر وکلاء نے جس انداز سے تحریک چلائی اور اس کے دوران تشدد برداشت کیا اس سے مجھے اُمید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس کے بعد حالیہ انتخابات کے بارے میں شدید خطرہ تھا کہ بڑے پیمانے پر دھاندلی سے قاف لیگ دوبارہ کامیاب ہو جائے گی' لیکن انتخابات کا عمل جس طرح بغیر کسی بڑے ہنگامے اور فساد کے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے اور اس کے جو نتائج سامنے آئے ہیں میرے نزدیک یہ بات بھی ایک معجزے سے کم نہیں۔ پاکستان کے بارے میں جب بھی میں نے اپنی مایوسی کا اظہار کیا ہے یہ بات ضرور کہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی معجزے کا اظہار ہو جائے تو ہمیں مزید مہلت عمل مل سکتی ہے۔

موجودہ حالات میں پرویز مشرف صاحب کی خواہش تو یہ ہے کہ سیکولر ذہن کی جماعتیں مل کر حکومت بنالیں اور ان کو صدر کے طور پر قبول کرلیں' لیکن ان کی آرزو پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (ن) جمع ہو کر حکومت بنائیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ پاکستان کے حق میں بہتر ہوگا اور اس طرح دستور پاکستان میں گزشتہ آٹھ برسوں میں جو من مانی ترامیم کی گئیں ان کا خاتمہ ہو سکے گا اور دستور اپنی اصلی حالت میں بحال ہو سکے گا۔ اس طرح جمہوری عمل ایک مثبت اور صحت مندانہ انداز میں آگے بڑھ سکے گا۔ اس میں شک نہیں کہ حالیہ انتخابات سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں امید کے چراغ روشن ہوئے ہیں اور اس ضمن میں اندیشوں اور مایوسیوں کے جو اندھیارے چھا رہے تھے اُن میں کسی نہ کسی درجے میں واضح طور پر کمی ہوئی ہے۔oo

(خطابِ جمعہ کے دوران حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ)

فہم حدیث

اسلامؔ ایمان اور احسان

حدیثِ جبرئیلؑ کی روشنی میں

جامع القرآن، قرآن اکیڈمی لاہور میں

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

کا ۸ جون ۲۰۰۷ء کا خطابِ جمعہ

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (النساء:۱۳۶)

﴿لَیْسَ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِیْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (المائدۃ)

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (الحُجُرٰت:۱۴)

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ:

بَیْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰی عَلَیْهِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ، حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَاَسْنَدَ رُكْبَتَیْهِ اِلٰی رُكْبَتَیْهِ وَوَضَعَ

كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ ، وَقَالَ : يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّا اِلٰـــهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ، وَتُؤْتِیَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا)) قَالَ : صَدَقْتَ، قَالَ : فَعَجِبْنَا لَـهٗ يَسْاَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ، قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِيْمَانِ! قَالَ : ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ، وَمَلَائِكَتِهٖ ، وَكُتُبِهٖ ، وَرُسُلِهٖ ، وَالْيَوْمِ الْآخِرِ، وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) قَالَ: صَدَقْتَ، قَالَ: فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ! قَالَ: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، فَاِنْ لَّمْ تَـكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنِ السَّاعَةِ! قَالَ : ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا! قَالَ : ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا، وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْيَانِ)) ثُمَّ انْطَلَقَ، فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِیْ: ((يَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟)) قُلْتُ : اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ، قَالَ : ((فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ، اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ))(رواہ مسلم)

آج جو حدیث ہمارے زیر مطالعہ ہے، اور جس کا متن میں نے آپ کو پڑھ کر سنایا ہے، اس کو ''حدیث جبرائیل'' کہا جاتا ہے اور اسے ''اُمّ السنۃ'' قرار دیا گیا ہے، یعنی سنت کی جڑ اور بنیاد۔ جیسے سورۃ الفاتحہ کو ''اُمّ القرآن'' قرار دیا گیا ہے، یعنی قرآن مجید کی جڑ اور بنیاد۔ اس حدیث کی عظمت کو عہدِ حاضر میں دو اشخاص نے پورے طور پر پہچانا ہے۔ ان میں سے ایک سفید فام امریکی William C.Cittic اور دوسری اس کی بیوی Sathio Mourata ہے جو کہ جاپانی ہے۔ ان کے بارے میں ابھی کوئی اطلاع نہیں ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہے یا نہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ ذہناً اور قلباً مسلمان ہیں اگرچہ انہوں نے اعلان نہ کیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا ہو، کیونکہ ہماری معلومات کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہے۔ واللہ اعلم! ان دونوں نے انتہائی گہرے مطالعے کے بعد اِس حدیث کی روشنی میں ایک کتاب شائع کی ہے جس کا عنوان ہے: "Vision of Islam" یہ کتاب تقریباً ڈھائی تین سو صفحات

پر مشتمل ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس موضوع پر ایک کتاب سہیل اکیڈمی لاہور نے شائع کی ہے جو بازار میں دستیاب ہے' جو لوگ علمی ذوق رکھتے ہوں وہ اسے حاصل کر کے پڑھیں۔

یہ حدیث احادیث کی پانچ کتابوں میں ہے اور پانچ ہی صحابہؓ سے منقول ہے' یعنی حضراتِ عمر بن خطاب' ابو ہریرہ' عبداللہ بن عباس' عبداللہ بن عمر اور ابو عامر رضی اللہ عنہم اجمعین۔ یہ حدیث عبداللہ بن عمرؓ سے چار طرق سے مروی ہے۔ ان میں سے جو متفق علیہ روایت ہے وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی روایت ہے' لیکن جو مقبول ترین روایت ہے' جس کا متن اوپر پیش کیا گیا ہے' یہ حضرت عمرؓ سے مروی ہے اور صحیح مسلم (کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان) میں ہے۔

مراتب میں تمام صحابہ کرامؓ برابر نہیں تھے' سب کے اپنے اپنے مراتب تھے۔ کچھ صحابہؓ کو فقہائے صحابہ کہا جاتا تھا' اس لیے کہ وہ فہم دین میں دوسروں سے زیادہ مرتبہ رکھتے تھے۔ ان میں حضرت عمرؓ چوٹی کے مقام پر ہیں۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی چوٹی کے فقہاءِ صحابہؓ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان صحابہؓ سے مروی احادیث کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

اس پر اتفاق ہے کہ یہ واقعہ جو اِس حدیث مبارک میں بیان ہو رہا ہے' یہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آیا ہے۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں ہے کہ یہ آپؐ کی زندگی کے آخری دنوں کا واقعہ ہے۔ مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی نے' جن کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا' اس حدیث کے تمام طرق اپنی کتاب ''ترجمان السنۃ'' میں تفصیلاً بیان کیے ہیں۔ اس حدیث میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ اصل میں تو حضرت عمرؓ کی روایت میں ہے' لیکن واقعہ کی تفصیلات کے ضمن میں کچھ مزید پہلو دوسری روایتوں میں آئے ہیں اور وہ بھی یہاں بیان کیے جائیں گے۔ ان میں یقیناً متن کے الفاظ میں بھی کچھ فرق ہے' لیکن واقعاتی تفصیل میں کچھ زیادہ فرق ہے۔ قرآن اور حدیث میں بنیادی فرق مَیں بیان کر چکا ہوں کہ قرآن وحیٔ جلی پر مشتمل ہے

اور وحی باللفظ ہے' یعنی الفاظ اللہ تعالیٰ کے ہیں جبکہ حدیث نبویؐ بھی اگرچہ وحی پر مبنی ہے لیکن وحیٔ خفی ہے۔ اس کے الفاظ متفق علیہ اور محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے کہ راویوں کے بیان میں لفظی طور پر فرق واقع ہو جاتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال ہے کہ آپ کسی محفل میں چند جملے بولیے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد حاضرینِ محفل سے پوچھئے کہ میں نے کیا کہا تھا' تو ہر ایک کے بیان کے اندر کچھ نہ کچھ فرق واقع ہو جائے گا۔ البتہ حدیث اپنی روح' اپنے ہدف اور مضمون کے اعتبار سے متفق علیہ ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اب ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی اس روایت کا متن وار مطالعہ کرتے ہیں۔ اسے پڑھتے ہوئے اگر ہم اپنے آپ کو اُس ماحول کا حصہ سمجھیں تو اس واقعے کو چشمِ تصور سے دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: **بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوْسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ ذَاتَ يَوْمٍ** ''اس اثنا میں کہ ایک دن ہم رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے تھے'' **اِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ' شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ** ''کہ اچانک ایک شخص نمودار ہوا۔ اس کے کپڑے انتہائی سفید اور اس کے بال انتہائی سیاہ تھے (میل اور گرد و غبار کے کوئی آثار نہیں تھے)''۔ ایک روایت میں **حَسَنُ الْوَجْهِ** ''نہایت خوبصورت انسان'' کے الفاظ بھی ہیں۔ لوگوں نے اُس وقت سوچا ہوگا کہ یہ کون ہیں؟ **لَا يُرٰى عَلَيْهِ اَثَرُ السَّفَرِ** ''اس شخص پر سفر کے کوئی آثار نہیں تھے''۔ اگر وہ باہر سے آیا ہوتا تو اُس کے کپڑے گرد آلود ہوتے' بالوں کے اندر کچھ غبار ہوتا۔ تو معلوم ہوا کہ یہ باہر سے نہیں آیا ہے۔ **وَلَا يَعْرِفُهٗ مِنَّا اَحَدٌ** ''اور ہم میں سے کوئی اسے پہچانتا بھی نہیں تھا''۔ ایک روایت میں اضافہ ہے: **فَنَظَرَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ** ''تو لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے''۔ گویا اشاروں سے ہی ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ یہ کون ہیں؟ تو معلوم ہوا کہ پوری مجلس میں ان کا کوئی شناسا نہیں۔ اگر وہ شخص کسی کے ہاں مہمان آیا ہوتا تو وہ میزبان اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ یہ میرے مہمان ہیں' اور اگر براہِ راست آئے ہوتے تو ان کے بالوں اور کپڑوں کے اوپر سفر کے کچھ آثار ہوتے۔ ایک روایت میں ہے کہ ''ان کی داڑھی کے بال نہایت سیاہ تھے''۔ عام بالوں کی بجائے داڑھی کے بالوں کے

تذکرے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عام طور پر عرب اپنے سر کو ڈھانپے ہوئے رکھتے تھے۔ اس لیے اس شخصیت کے داڑھی کے بالوں کا تذکرہ ہے کہ وہ انتہائی سیاہ تھے۔

حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ ''یہاں تک کہ وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آ بیٹھا''۔ ایک روایت میں ہے: قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ آتِیْکَ؟ اس نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا میں حاضر ہو جاؤں؟ قَالَ: ((نَعَمْ)) ''آپؐ نے فرمایا: ''ہاں آؤ''۔ بلکہ اس روایت میں ہے کہ آپؐ نے لوگوں سے کہا: ((اَدْنُوْہُ)) ''اسے قریب آنے دو''۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے حکم سے مجمع چھٹ گیا ہوگا اور راستہ بن گیا ہوگا' لہٰذا وہ تیر کی طرح سیدھا آیا اور آپؐ کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ اِلٰی رُکْبَتَیْہِ ''پس اس نے اپنے دونوں گھٹنے رسول اللہ ﷺ کے دونوں گھٹنوں سے ملا دیے''۔ آنجناب ﷺ بھی دوزانو تشریف فرما ہوں گے اور وہ بھی دوزانو ہو گئے' لہٰذا دونوں کے گھٹنے ایک دوسرے کو چھونے لگے۔ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ. اس جزو کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں' یعنی ''اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے زانوؤں پر رکھ دیں'' یا ''اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنحضور ﷺ کے زانوؤں پر رکھ دیں''۔ اس لیے کہ فَخِذَیْہِ میں ضمیر ''ہٗ'' دونوں طرف ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک دوسری روایت میں وضاحت ہے: عَلٰی رُکْبَتَیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ ''اس نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آپ ﷺ کے گھٹنوں پر رکھ دیں''۔ وَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ ''اور اس نے کہا: اے محمد (ﷺ)''۔ ایک روایت میں ''یَارَسُوْلَ اللّٰہِ'' کے الفاظ ہیں کہ اُس نے کہا: ''اے اللہ کے رسول!'' اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے!'' ایک روایت میں ہے: حَدِّثْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ یا حَدِّثْنِیْ بِالْاِسْلَامِ ''میرے لیے بیان فرمائیے کہ اسلام کیا ہے!''

فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: ((اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ، وَتُقِیْمَ الصَّلَاۃَ، وَتُؤْتِیَ الزَّکَاۃَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا)) ''تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تو

گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں' اور تو نماز قائم کرے' زکوٰۃ ادا کرے' رمضان کے روزے رکھے اور بیت اللہ کا حج کرے اگر تجھے اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو''۔ قَالَ : صَدَقْتَ ''اس شخص نے کہا: آپؐ نے درست فرمایا''۔ فَعَجِبْنَا لَـهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ 'تو ہمیں تعجب ہوا اُس شخص پر کہ رسول اللہ ﷺ سے سوال کرنے کے ساتھ ساتھ تصدیق بھی کر رہا ہے!'' یہ انداز تو استاد کا ہوتا ہے کہ شاگرد سے سوال پوچھتا ہے' اور اگر وہ درست جواب بتائے تو اُس کی تصدیق کرتا ہے' اسے شاباش دیتا ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے اور سمجھ گئے کہ اس معاملے میں آپؐ کی اجازت شامل ہے۔

قَالَ : فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِيْمَانِ ''پھر اس نے کہا کہ اب مجھے بتائیے کہ ایمان کیا ہے!'' قَالَ : ((اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ' وَمَلَائِكَتِهٖ ' وَكُتُبِهٖ' وَرُسُلِهٖ' وَالْيَوْمِ الْآخِرِ' وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ)) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو یقین رکھے اللہ پر' اُس کے فرشتوں پر' اُس کی کتابوں پر' اُس کے رسولوں پر' قیامت کے دن پر اور اچھی بری تقدیر پر (کہ جو خیر یا شر کسی پر وارد ہوتا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے)''۔ قَالَ: صَدَقْتَ ''وہ شخص بولا: آپ (ﷺ) نے ٹھیک فرمایا''۔

قَالَ: فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِحْسَانِ ''پھر اس نے کہا کہ مجھے احسان کے بارے میں بتائیے''۔ قَالَ: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ' فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) ''آپؐ نے فرمایا: اس کیفیت میں اللہ کی بندگی کرنا گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو رہی) تو (یہ کیفیت تو پیدا ہو کہ) وہ تجھے دیکھ رہا ہے''۔ ایک روایت میں ((اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى)) ''کہ تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے'' اور ایک روایت میں ((اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ)) ''کہ تو عمل کرے اللہ کے لیے (یا محنت کرے اللہ کے لیے) کے الفاظ آئے ہیں''۔

قَالَ : فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ ''(پھر) اس نے کہا: مجھے قیامت کے بارے میں بتائیے''۔ قَالَ : ((مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ)) ''رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: جس سے (قیامت کے بارے میں) پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا''۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((فِیْ خَمْسٍ مِنَ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهُنَّ اِلَّا هُوَ)) ''یہ غیب کی ان پانچ چیزوں میں سے ہے جن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں'' اور پھر رسول اللہ ﷺ نے سورۂ لقمان کی آخری آیت تلاوت کی:

﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ ۚ وَیَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌۢ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۳۴﴾﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے جس کے پاس قیامت کا علم ہے (کہ وہ کب آئے گی)۔ اور وہی بارش برساتا ہے' اور وہی جانتا ہے کہ ماؤں کے پیٹوں میں کیا ہے۔ اور کسی انسان کو یہ معلوم نہیں کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا۔ اور (اسی طرح) کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کی موت کس جگہ واقع ہوگی۔ بے شک اللہ ہی ہر چیز کا علم رکھنے والا (اور) ہر شے سے باخبر ہے''۔

قَالَ : فَاَخْبِرْنِیْ عَنْ اَمَارَاتِهَا؟ ''اُس شخص نے پوچھا: تو مجھے اس کی نشانیاں بتا دیجیے!'' قَالَ : ((اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: (جب تم دیکھو) کہ لونڈی اپنی مالکہ کو جنے''۔ اکثر کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اولاد سرکش ہو جائے گی۔ بیٹیاں عام طور پر اپنے والدین کا زیادہ ادب کرنے والی ہوتی ہیں' والدین کے سامنے اپنی آوازوں کو پست رکھتی ہیں' ان کا حال یہ ہو جائے گا گویا اپنی ماؤں کی مالکہ ہیں' مائیں ان سے ڈریں گی کہ ان کی کسی غلط بات پر انہیں ٹوک دیا تو معلوم نہیں وہ کیا ردّعمل ظاہر کریں گی۔ ((وَاَنْ تَرَی الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ یَتَطَاوَلُوْنَ فِی الْبُنْیَانِ)) ''اور یہ کہ تم دیکھو گے کہ ننگے پاؤں' ننگے بدن' محتاج' بکریوں کو چرانے والے اونچی اونچی عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں گے۔'' یہ صورت حال آج عالمِ عرب میں صد فیصد موجود ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں حضرت جبرائیلؑ کے پانچویں سوال کا بھی ذکر ہے: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَنْ اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاةُ الْجِیَاعُ الْعَالَةُ 'یارسول اللہ! بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے'

تنگدست کون لوگ ہیں؟'' قَالَ: ((اَلْعَرَبُ)) ''آپ ﷺ نے فرمایا: وہ عرب ہوں گے''۔ یہ صورتِ حال آج ہمارے سامنے ہے۔ دبئ کہاں سے کہاں پہنچا ہوا ہے! سو سال پہلے یہاں کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا' پہننے کے لیے کپڑے نہیں تھے' پاؤں میں جوتے نہیں ہوتے تھے۔ پورے عرب کا یہی معاملہ تھا۔ تقریباً ستر اَسّی برس سے یہ صورتِ حال مکمل طور پر تبدیل ہوگئی ہے' جب سے تیل دریافت ہوا ہے۔ اب یہ خوشحالی کہاں تک پہنچ گئی ہے' اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ عرب کے صحرا گل وگلزار کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ آپ اگر ابوظبی کے ایئرپورٹ سے ابوظبی شہر جائیں تو درمیان میں آپ کو ایسا نقشہ نظر آئے گا گویا یہ چمن زار ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ہری بھری گھاس اور پھول ہیں اور سڑک کے دونوں طرف اونچے اونچے پشتے بنا دیے گئے ہیں تاکہ اس سے آگے صحرا کی طرف نگاہ نہ جائے۔ اس طرح بہت خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ پھر یہ کہ عرب میں سیون سٹار ہوٹل ہیں۔ دبئ' جدہ' ریاض وغیرہ کی ساحلی سڑکیں اتنی عالی شان' آراستہ و پیراستہ اور خوبصورت ہیں کہ اس قدر حسین منظر میں نے امریکہ میں بھی نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں دبئ باقی عرب کے بعد اُبھرنا شروع ہوا لیکن اب سب سے آگے ہے۔

متحدہ عرب امارات (UAE) میں مجھے گئے ہوئے اب تو ایک طویل عرصہ ہوگیا ہے' کیونکہ تیرہ چودہ سال سے میرے وہاں داخلے پر پابندی ہے۔ اس پابندی سے پہلے ایک مرتبہ مَیں وہاں گیا ہوا تھا اور ایک بلڈنگ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بلند و بالا عالی شان بلڈنگ تھی جسے گرایا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا افتاد ہے کہ اسے گرا رہے ہیں؟ ابھی تو یہ شہر آباد ہوا ہے' کوئی پرانی عمارت تو ہے نہیں! کہنے لگے کہ اس کے قریب ایک اس سے اونچی عمارت بن گئی ہے' لہٰذا اب اس عمارت کو گرا کر از سرِ نو مزید اونچی عمارت بنانی ہے۔ گویا عمارتوں کو اونچا کرنے میں وہ ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے فرماتے ہیں: ثُمَّ انْطَلَقَ ''پھر وہ شخص چلا گیا''۔ فَلَبِثْتُ

مَلِیًّا ''تو مَیں کچھ دیر متردّد سا رہا''۔ میرے ذہن میں یہ الجھن رہی کہ یہ سائل کون تھا۔ ثُمَّ قَالَ لِیْ: ((یَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟)) ''پھر رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے دریافت فرمایا: اے عمر! تمہیں معلوم ہوا یہ سائل کون تھا؟'' قُلْتُ : اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ ''میں نے کہا: اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عام معمول یہی تھا کہ آپؐ کے سوال دریافت فرمانے پر وہ کہتے تھے: ''اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ قَالَ : ((فَاِنَّہٗ جِبْرِیْلُ' اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ)) ''یہ جبرئیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے''۔

یہ اختتامی حصہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بہت ہی مختصر اور نامکمل ہے۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہی وہ شخص واپس گیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی وہاں سے کسی ضرورت کے تحت روانہ ہو گئے۔ چنانچہ بعد میں جو واقعہ پیش آیا وہ انہیں معلوم نہیں تھا۔ دوسری روایت کے مطابق ذرا سا توقف کے بعد وہ شخص چلا گیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((رُدُّوْہُ)) ''اسے واپس میرے پاس لاؤ''۔ ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ((اِلْتَمِسُوْہُ)) ''اسے تلاش کرو''۔ فَلَمْ یَرَوْا شَیْئًا ''تو انہیں کوئی شے نہیں ملی''۔ اُس آدمی کا کہیں سراغ نہ ملا۔ اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں ملیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جبرائیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے''۔ اس کے بعد اور الفاظ بھی ہیں جو مسند احمد میں ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ جَاءَ نِیْ قَطُّ اِلَّا وَاَنَا اَعْرِفُہٗ اِلَّا تَکُوْنُ ھٰذِہِ الْمَرَّۃُ)) ''اُس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے' جب کبھی بھی جبرائیلؑ میرے پاس آئے میں اُن کو پہچان لیتا تھا' سوائے اس مرتبہ کے''۔ حضرت جبرائیلؑ ایک تو فرشتے کی شکل میں تشریف لاتے' اُس وقت غیر مرئی ہوتے' صرف آواز سنائی دیتی تھی۔ ان کی آواز بھی لفظی نہیں تھی' بلکہ گھنٹیوں کی آواز کی طرح ہوتی تھی۔ (جیسے تار گھر میں غرغر ہوتا تھا اور اسی سے پھر پیغام بنا لیا جاتا تھا۔) جبرائیلؑ جو پیغام لے کر آتے تھے وہ الفاظ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قلب مبارک پر اُتر جاتا تھا۔ لیکن متعدد مواقع پر

حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس انسانی شکل میں آتے تھے جس کا ایک واقعہ یہاں آپ کے سامنے آیا۔ حضرت جبرائیلؑ عام طور پر ایک خوبصورت صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی شکل میں آتے تھے' لیکن رسول اللہ ﷺ پہچان جاتے تھے کہ یہ دحیہ نہیں ہیں' بلکہ دحیہ کی شکل میں حضرت جبرائیلؑ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ ہیں: ((مَا جَاءَ نِیْ فِیْ صُوْرَةٍ اِلَّا عَرَفْتُهٗ غَیْرَ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ)) ''حضرت جبرائیلؑ جس شکل وصورت میں بھی میرے پاس تشریف لاتے تھے میں انہیں پہچان لیتا تھا سوائے اس مرتبہ کے۔''

یہ بھی جان لیجیے کہ آپؐ نے جو فرمایا کہ ''یہ جبرائیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے'' تو اس ضمن میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی آئے ہیں: ((اَرَادَ اَنْ تَعَلَّمُوْا اِذْ لَمْ تَسْئَلُوْا)) ''جبرائیلؑ اس لیے آئے تھے کہ انہوں نے چاہا کہ تم وہ چیزیں جان لو جن کے بارے میں تم نے سوال نہیں کیا۔'' یعنی دین کی بعض حقیقتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں تمہیں سوال کرنا چاہیے تھا' لیکن تم نے نہیں کیا' لہٰذا حضرت جبرائیلؑ اس خلاء کو پُر کرنے کے لیے آئے تھے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ صحابہؓ نے کہا: مَا رَاَیْنَا رَجُلًا اَشَدَّ تَوْقِیْرًا لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ هٰذَا ''ہم نے کسی انسان کو نہیں دیکھا کہ وہ اللہ کے رسول ﷺ کی اتنی عزت کرتا ہو جتنی کہ وہ شخص کر رہا ہے۔'' كَاَنَّهٗ یَعْلَمُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے واقف ہے۔'' یعنی آپؐ کے مرتبے اور آپؐ کی نبوت ورسالت کو خوب پہچانتا ہے۔

آپ نے اس واقعہ کی ابتدا بھی دیکھ لی اور انتہا بھی۔ اس واقعہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جو الفاظ ہیں کہ: فَلَبِثْتُ مَلِیًّا ''تو مَیں کچھ دیر بڑا متردّد رہا''۔ تو اس بارے میں روایات میں آتا ہے کہ ہوسکتا ہے رسول اللہ ﷺ کی جناب میں حضرت عمرؓ کی حاضری دو تین دن بعد ہوئی ہو' کیونکہ یہ معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابیؓ دونوں مشترکہ طور پر ایک دکان چلاتے تھے اور حضرت عمرؓ کا ان کے ساتھ ایک معاہدہ تھا کہ ایک

دن دکان پر تم بیٹھو گے اور میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہوں گا اور اگلے دن میں دکان پر بیٹھوں گا اور تم رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض حاصل کرو گے۔ تو شاید اگلے دن آپؓ اپنے اس معاہدے کی وجہ سے نہیں آئے اور دوسرے دن ہوسکتا ہے انہیں کوئی اور مصروفیت ہو۔ اب جب آئے تو رسول اللہ ﷺ نے اُن کے چہرے پر پڑھ لیا کہ یہ متردد سے ہیں، کسی تشویش میں ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے خود ہی پوچھا: ((یَا عُمَرُ اَتَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟)) ''اے عمر! تمہیں معلوم ہوا کہ یہ سائل کون تھا؟'' تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ''میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں''۔ قَالَ: ((فَاِنَّهٗ جِبْرِیْلُ، اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ)) ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ جبرائیلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لیے آئے تھے''۔

اس حدیث میں جو چار سوال آئے ہیں جن کے رسول اللہ ﷺ نے جوابات دیے ہیں، ان میں اہم ترین پہلے دو سوال ہیں، یعنی اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ہے۔ روایات میں سوالات کی ترتیب میں بھی فرق ہے۔ ابن عمرؓ کی روایت میں پہلا سوال ایمان کے بارے میں ہے اور دوسرا سوال اسلام کے بارے میں ہے، جبکہ اس روایت اور دوسری اکثر روایات میں پہلا سوال اسلام کے بارے میں ہے اور دوسرا سوال ایمان کے بارے میں ہے۔ بہرحال اسلام اور ایمان کے بارے میں یہ سوالات بہت اہم ہیں، جن کی وضاحت بعد میں ہوگی۔ تیسرا سوال جو ''احسان'' کے بارے میں ہوا، وہ بھی بہت اہم ہے۔ یہ روحانیت کے بارے میں ہے اور ہمارے ہاں تصوف اس کا موضوع بن گیا ہے۔ اس بارے میں بھی آپ ﷺ نے یہاں فرما دیا ہے کہ دین میں روحانیت کے ضمن میں صحیح روش کیا ہونی چاہیے۔ اس لیے کہ بعد میں دین میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں وہ تین گوشوں سے ہوئی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو تبع تابعی تھے، بہت نیک اور مجاہد انسان تھے، ان کا ایک شعر ہے:

وھل افسد الدین الا الملوک
واحبار سوء ورھبانھا

''دین میں فساد تین طرح سے آتا ہے (یا آیا ہے): ایک بادشاہوں اور سلاطین کے ذریعے سے، دوسرے علماءِ سوء کے ذریعے سے اور تیسرے راہبوں کے ذریعے سے''۔

معلوم ہوتا ہے کہ اُس دَور میں بھی فساد آ چکا تھا۔ اور آج کے دَور میں تو یہ فساد اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآن: ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ﴾ (الروم: ٤١) ''خشکی اور تری میں فساد برپا ہو گیا ہے لوگوں کے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے''۔ اُس دَور کے لوگوں نے محسوس کر لیا کہ اِس فتنہ و فساد کا ذریعہ یہ تین گروہ ہیں۔ ایک تو وہ بادشاہ و سلاطین جو اپنے مفادات کے لیے دین میں تحریف کرواتے ہیں۔ دوسرے دین فروش اور فتویٰ فروش علماء، جو اپنے دین اور اپنے علم کو کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں، اور تیسرے یہ راہب۔ رہبانیت جب آتی ہے تو دین کے اندر فتور اور فساد پھیلاتی ہے۔ انہی تین گروہوں کے بارے میں علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری!
اے کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری!

یعنی اے مسلمان! آج تیرا آئینۂ ضمیر دھندلا گیا ہے تو اس کی وجہ وہ زخم ہیں جو تجھے تین اطراف سے لگے ہیں۔ یہ زخم لگانے والے تین قسم کے لوگ ہیں: ایک پیشہ ور مذہبی مُلّا، دوسرے بادشاہ، تیسرے پیری مریدی کرنے والے۔ موجودہ حالات اس کی مکمل عکاسی کر رہے ہیں، اِلّا ماشاءَ اللہ۔

چوتھا سوال نبی اکرم ﷺ سے قیامت اور علاماتِ قیامت کے بارے میں ہے۔ اس حدیث میں جو دو علاماتِ قیامت بیان ہوئی ہیں وہ آج روزِ روشن کی طرح ہمارے سامنے آ گئی ہیں، یعنی اولاد کی سرکشی اور نادار لوگوں کا خوشحال ہو کر محلّات میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنا۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ)) (١)

''میری بعثت میں اور قیامت میں اتنا قرب ہے جتنا اِن دو انگلیوں (شہادت والی انگلی اور درمیانی انگلی) کے مابین ہے''۔

یعنی میرے بعد اب نہ کوئی نبی و رسول آئے گا اور نہ کوئی اُمت آئے گی' بلکہ اب قیامت ہی آئے گی۔ گویا آپ ﷺ کی بعثت ہی فی نفسہٖ علاماتِ قیامت میں سے ہے۔ اس کے بعد پھر چھوٹی بڑی علامتیں ہیں۔ کتب احادیث میں علاماتِ قیامت کی احادیث پر مشتمل پورے پورے باب باندھے گئے ہیں۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔

پانچواں سوال جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے یہ کیا کہ یہ: ''اَصْحَابُ الشَّاءِ الْحُفَاةُ الْجِيَاعُ الْعَالَةُ'' کون لوگ ہیں کہ بکریاں چرانے والے' برہنہ پا' بھوکے اور تنگ دست ہونے کے باوجود قیامت کے قریب اتنے خوشحال ہو جائیں گے کہ بڑی بڑی عمارات میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوشش کریں گے؟ اس سوال کے جواب میں آپؐ نے فرمایا کہ یہ عرب ہوں گے۔ اب جزیرہ نمائے عرب کا مشرقی ساحل اور مغربی ساحل بعینہٖ یہ نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ البتہ جنوبی ساحل کے ساتھ صحرا ہے جہاں آبادی ہے ہی نہیں۔ اسے ''الربع الخالی'' کہتے ہیں۔ یہاں زندگی کا وجود نہیں ہے۔ یہاں کی ریت بھی ایسی ہے کہ اس پر کوئی شے ٹھہر ہی نہیں سکتی' بلکہ نیچے دھنستی چلی جاتی ہے' جیسے دلدل میں ہوتا ہے کہ آدمی کا پاؤں پڑ جائے تو پھر اس کا باہر نکلنا محال ہوتا ہے۔ ایسے صحراؤں کو ''Quick Sands'' کہا جاتا ہے۔ یہ اصل میں قومِ عاد کا مسکن تھا۔ قومِ عاد کی بڑی زبردست تہذیب تھی۔ اسی قوم میں شداد تھا جس نے اپنی جنت بنائی تھی۔ اب شداد کا وہ شہر بھی دریافت ہو گیا ہے جو اِسی ریت کے اندر دبا ہوا ہے۔ اس میں بڑی مضبوط فصیل کے اوپر بہت مضبوط ستون کھڑے نظر آ رہے ہیں۔ جیسے قرآن مجید میں کہا گیا ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ ۝ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ۝ الَّتِيْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِي الْبِلَادِ ۝﴾ (الفجر) ''کیا تم نے (اے پیغمبرؐ!) دیکھا نہیں کہ تمہارے ربّ نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عادِ ارم کے ساتھ جن کے مانند کوئی قوم دنیا کے

ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی؟''

اب آیئے اس طرف کہ زیر مطالعہ حدیث میں جو دو اہم سوال آئے ہیں ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے بارے میں' ان کی اہمیت کا پس منظر کیا ہے۔ اکثر اوقات قرآن مجید کے عام پڑھنے والوں کو ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے بارے میں اُلجھن ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ ایمان اور اسلام زیادہ تر مترادف الفاظ کے طور پر آئے ہیں۔ مسلم کو مؤمن کہہ دیں' مؤمن کو مسلم کہہ دیں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ گلاب کو کسی بھی نام سے پکاریں وہ یکساں خوشبو دے گا۔ چنانچہ جو اللہ تعالیٰ کا فرماں بردار ہے اور اس کے دل میں ایمان ویقین بھی ہے تو آپ اسے مؤمن کہہ دیں یا مسلم کہہ دیں کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن سورۃ الحجرات کی آیت ۱۴ جس کی خطبہ میں تلاوت کی گئی ہے' اس میں نہ صرف یہ کہ ''اسلام'' اور ''ایمان'' مترادف نہیں ہیں بلکہ ایمان بمقابلہ اسلام آیا ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ (الحُجُرٰت: ١٤)

''یہ بدو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے' (اے نبیؐ!) ان سے کہہ دیجیے تم ہرگز ایمان نہیں لائے' لیکن یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

یہاں پر ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' آیا ہے ''مَا اٰمَنْتُمْ'' نہیں آیا۔ یہ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر ماضی سے پہلے ''مَا'' آ جائے تو یہ بھی نفی ہے لیکن اس نفی میں شدت اور تاکید نہیں ہوتی' لیکن اگر مضارع سے پہلے ''لَمْ'' آ جائے تو یہ تاکیداً نفی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' کا ترجمہ کیا ہے ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے''۔ یہاں ایک تضاد کی سی شکل بن گئی ہے کہ ایمان اور اسلام مترادف ہیں یا ایک دوسرے کی ضد؟ مذکورہ بالا آیت کریمہ میں بدوؤں کا اسلام تو قبول کیا جا رہا ہے بایں الفاظ: ﴿وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''لیکن تم یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں'' لیکن ایمان کی پُرزور نفی کی جا رہی ہے کہ: ﴿لَمْ

تُؤْمِنُوْا﴾ ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے'' اور :﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ ''اور ایمان ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔

اسلام اور ایمان کے علاوہ قرآن حکیم میں کچھ اور الفاظ بھی ہیں جو باہم مترادف بھی آئے ہیں اور باہم متضاد بھی' جیسے ''نبی'' اور ''رسول''۔ اِن کے بارے میں علماءِ کرام نے ایک اصول بنایا ہے کہ :اِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا وَاِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا ''جب یہ الفاظ علیحدہ علیحدہ آئیں گے تو اِن کا مفہوم ایک ہی ہوگا اور جب ایک مقام پر آئیں گے تو اِن کے معنی جدا جدا ہو جائیں گے''۔ لہٰذا اسلام اور ایمان جب ایک ساتھ آئیں گے تو اسلام کے معنی اور ہوں گے ایمان کے اور ہوں گے۔ یہی معاملہ ''نبی'' اور ''رسول'' کا ہے۔ جب ان کا علیحدہ علیحدہ ذکر ہو رہا ہوگا تو وہاں پر نبی کو رسول اور رسول کو نبی کہہ دینے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں دونوں لفظ ایک ہی جگہ پر آئیں تو وہاں نبی اور رسول کا فرق واضح ہو جائے گا۔ پس ایک تو یہاں ''اسلام'' اور ''ایمان'' کے ضمن میں پیدا ہونے والی اُلجھن کا حل مطلوب ہے۔ دوسرا یہ کہ بعض ایسی احادیث موجود ہیں جن میں انسان کے بعض اعمال پر اس کے ایمان کی نفی کی گئی ہے۔ جیسے رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ ' وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُھَا وَھُوَ مُؤْمِنٌ))(۲)

''کوئی زانی حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرسکتا' کوئی چور حالت ایمان میں چوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی شرابی حالت ایمان میں شراب پیتا ہے''۔

جب کوئی شخص یہ کام کر رہا ہوتا ہے تو ایمان اُس کے دل سے رخصت ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ بات ناقابل یقین ہے کہ ایمان بھی ہو اور یہ کام بھی ہو رہے ہوں۔ اس بات کی بعض احادیث میں وضاحت موجود ہے کہ اس دوران ایمان اس کے دل سے نکل کر ایک پرندے کی مانند چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور علماء کا اس پر تقریباً اتفاق ہے کہ وہ انسان جونہی اس عمل سے فارغ ہوتا ہے تو ایمان دوبارہ اس کے دل میں آجاتا ہے۔ حالانکہ منطقی طور

پر تو یہ ہونا چاہیے کہ انسان توبہ کرے تب ہی اس کا ایمان واپس آئے۔ بہر حال اس سے ایک بات ثابت ہو جاتی ہے کہ گناہِ کبیرہ سے گویا ایمان کی نفی ہوتی ہے۔

یہ وہ چیز ہے جس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے سے بہت بڑی گمراہی پیدا ہوئی۔ چنانچہ اسلام میں سب سے زیادہ گمراہ فرقہ ''خوارج'' اسی بنیاد پر گمراہی کا شکار ہوا۔ انہوں نے یہ عقیدہ گھڑ لیا کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب کافر ہے' اور جب کافر ہے تو گویا مرتد ہے' لہٰذا اس کی جان اور مال مباح ہے' اسے قتل کر دیا جائے اور اس کا مال لے لیا جائے' وہ مالِ غنیمت ہو گا۔ اس کی عورتیں مباح ہو جائیں گی' وہ لونڈیاں بن جائیں گی۔ یہ خوارج کا فتنہ بہت خطرناک فتنہ تھا۔ یہ فتنہ حضرت علیؓ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گیا اور بعد میں بڑھتا چلا گیا۔ ان لوگوں کو جو غلط فہمی پیدا ہوئی تھی وہ اصل میں انہی احادیث سے ہوئی تھی۔ حالانکہ بعض احادیث میں یہ اسلوب گناہِ کبیرہ سے بھی کمتر گناہوں اور کوتاہیوں کے لیے آیا ہے۔ ایک حدیث میں تو یہاں تک آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ' وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) ''خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے' خدا کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں ہے''۔ قَالُوْا وَمَا ذَاکَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ ''صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! کون؟'' فرمایا: ((اَلْجَارُ لَا يَاْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ))[۳] ''وہ شخص جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہیں ہے''۔ اب یہاں کوئی گناہِ کبیرہ کا ذکر تو نہیں ہے' بلکہ بداخلاقی کا معاملہ ہے۔ کوئی شخص اپنے اخلاق کے اندر اتنا گرا ہوا ہے کہ اس کی وجہ سے اس کا پڑوسی بے چین اور پریشان ہے' تو ایسے شخص کے بارے میں آپؐ تین دفعہ قسم کھا کر اس کے ایمان کی نفی کر رہے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ ایمان کی نفی کے معنی لازماً کفر نہیں ہیں' جیسا کہ خوارج نے سمجھ لیا' بلکہ کفر اور ایمان کے مابین ایک مقام ''اسلام'' کا ہے۔ لہٰذا ایسا شخص مسلمان شمار ہو گا۔ چوری کرتے ہوئے بھی مسلمان ہے' شراب پیتے ہوئے بھی مسلمان ہے اور زنا کرتے ہوئے بھی مسلمان ہے۔ عین اُسی حالت میں جان نکل جائے تو بھی اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اگرچہ اس کا جرم ثابت ہو جانے پر حد جاری کی جائے گی۔

اسی طرح قرآن مجید کے بعض مقامات پر دو ایمانوں کا ذکر ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ میں فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اِس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے''۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک درجے میں تم پہلے ہی مؤمن ہو لیکن اصل ایمان کچھ اور ہے جس کی ابھی ضرورت ہے۔

[اس حدیث (حدیث جبرائیلؑ) کا مطالعہ جاری ہے!]

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○

(ترتیب وتسوید: حافظ محمد مشتاق ربانی۔ طارق اسماعیل ملک)

حواشی

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق ، باب قول النبی ﷺ بعثت انا والساعة کهاتین۔ وصحیح مسلم، کتاب الجمعة، باب تخفیف الصلاة والخطبة۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الحدود، باب اثم الزناة۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان نقصان الایمان بالمعاصی ونفیه عن المتلبس۔

(۳) مسند احمد۔

نبی اکرم ﷺ سے ہمارا تعلق
اور اِس کے تقاضے

انجینئر نوید احمد ☆

ربیع الاوّل کے مہینے کو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ سے ایک خاص نسبت حاصل ہے۔ معروف سیرت نگاروں کی مستند تحقیق کے مطابق آپ ﷺ کی ولادت ۹ ربیع الاوّل کو اور وصال ۱۲ ربیع الاوّل کو ہوا۔ اِن سیرت نگاروں میں علامہ شبلی نعمانی، قاضی سلیمان منصور پوری، مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری اور محمود پاشا فلکی شامل ہیں۔

اسلام میں کسی برگزیدہ ہستی کی تاریخِ ولادت یعنی سالگرہ یا تاریخِ وصال یعنی برسی کو کوئی خاص اہمیت نہیں۔ قرآنِ حکیم میں صرف اُن انبیاء کی ولادت کا ذکر ہے جن کی پیدائش عام دستور سے ہٹ کر معجزانہ طریقہ سے ہوئی، جیسے حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام۔ نبی اکرم ﷺ کی ولادت کا قرآنِ حکیم میں سرے سے ذکر ہی نہیں۔ البتہ آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر ہے جس کے معنی پیدائش کے نہیں ہیں۔ لفظ بعثت قرآنِ مجید میں کئی مفاہیم میں استعمال ہوا ہے :

۱) بھیجنا: قابیل نے جب حضرت ہابیل کو شہید کر دیا تو اُسے معلوم نہ تھا کہ اپنے اِس بھائی کی میت کے ساتھ کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بھائی کی میت کی تدفین سکھانے کے لیے ایک کوّا بھیجا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ﴾ (المائدۃ: ۳۱)

''تو اللہ نے بھیجا ایک کوّا جو زمین کو کرید رہا تھا تاکہ اُسے دکھائے کہ وہ کیسے دفن کرے اپنے بھائی کی لاش کو''۔

☆ اکیڈمک ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی کراچی

بعثت کا لفظ بھیجنے کے معنی میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے اِن الفاظ میں آیا:

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ (البقرۃ:۲۱۳)

''پھر اللہ نے بھیجا انبیاءؑ کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر''۔

یہ لفظ نبی کریم ﷺ کے لیے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۶۴ میں ایک خاص شان کے ساتھ آیا:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِهِمْ .....﴾

''اللہ نے مؤمنوں پر بڑا احسان کیا جب کہ بھیجا اُن میں ایک رسولؐ اُنہی میں سے''۔

۲) مقرر کرنا: بنی اسرائیل میں حضرت طالوت کو بادشاہ مقرر کرنے کا اعلان اُس وقت کے نبیؑ نے اِن الفاظ میں کیا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾ (البقرۃ: ۲۴۷)

''بے شک اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے''۔

۳) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا: ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا﴾ (المُجادلۃ: ٦)

''اُس روز اللہ ان سب کو زندہ کرے گا''۔

۴) کھڑا کرنا: احوالِ قیامت میں سے ایک منظر یوں بیان کیا گیا :

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ (النحل: ٨٤)

''اور اُس روز ہم کھڑا کریں گے ہر اُمت میں سے ایک گواہ''۔

۵) عذاب نازل کرنا: عذاب کی تین صورتوں کا نزول اِس طرح بیان کیا گیا :

﴿قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّ يُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ﴾ (الانعام: ٦٥)

''کہہ دیجیے وہ (اللہ) قدرت رکھتا ہے کہ تم پر بھیج دے عذاب تمہارے اوپر سے، یا تمہارے قدموں کے نیچے سے، یا تمہیں تقسیم کر دے گروہوں میں اور ایک گروہ کو دوسرے کی قوت کا مزہ چکھا دے''۔

٦) مسلط کرنا: بنی اسرائیل پر عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿ بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَا اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ ﴾ (بنی اسرائیل : ٥)

''ہم نے مسلط کیے تم پر اپنے (عذاب کے نزول کے لیے) وہ بندے جو شدید

جنگجو تھے''۔

عیسائیوں کے ہاں یومِ پیدائش یا سالگرہ کی اہمیت ہے اور اُنہوں نے عیسوی سال کی تقویم کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے کیا۔ اِس کے برعکس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قمری سال کی تقویم کا آغاز ہجرت جیسے قربانی وایثار کے عظیم عمل سے کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات اور معمولات میں ماہِ ربیع الاول میں سیرت کے موضوع پر جلسوں' جلوسوں یا جشن کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ وہ سارا سال نبی کریم ﷺ کی سیرت کو یاد رکھتے اور آپ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے تھے۔ ہمارا عمل کا معاملہ تو بہت کمزور ہے جس کی تلافی ہم ماہِ ربیع الاوّل میں جلسوں اور جلوسوں میں جوش وخروش دکھا کر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ایک داعی کی مثال اُس کسان کی سی ہوتی ہے جو زمین میں بیج ڈالنے کے لیے سازگار موسم کا منتظر ہوتا ہے۔ اِس اعتبار سے ماہِ ربیع الاوّل میں سیرت کے موضوع پر بیانات کی یہ افادیت ہے کہ اِس ماہ میں سیرت پر بڑے ذوق وشوق سے جلسے' جلوس اور اخبارات میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہوتا ہے' لہٰذا ایسے میں لوگوں کو سیرت کے عملی پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فضا زیادہ سازگار ہوتی ہے۔

☆ سیرت پر بیان کے دو اسلوب :

نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر گفتگو کے دو اسالیب ممکن ہیں :

۱) آپ ﷺ کے ذاتی محاسن بیان کرنا اور آپ ﷺ کی خدمت میں نعتوں کی صورت میں ہدیۂ عقیدت اور درود وسلام بھیجنا۔

۲) سیرت النبی ﷺ سے رہنمائی لیتے ہوئے عملی اعتبار سے اپنے جملہ معاملات میں سنتِ رسول ﷺ پر عمل پیرا ہونے کی اہمیت اجاگر کرنا۔

آپ ﷺ کے ذاتی محاسن بیان کرنے کے اعتبار سے تو ہر وہ شخص جو آپ ﷺ کو نبی تسلیم کرتا ہے خود کو عاجز محسوس کرتا ہے۔ کسی نبی کے مقام سے تو کوئی نبی ہی واقف ہوسکتا ہے' پھر نبی بھی وہ جو درجہ میں اُس نبی سے بلند ہو۔ نبی اکرم ﷺ تو تمام انبیاء کے بھی سردار ہیں اور آپ کا ذکر تو خود اللہ نے بلند کر دیا ہے :

﴿وَرَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ﴾ (الانشراح)

''اور ہم نے آپ ﷺ کا ذکر بلند کر دیا''۔

لہٰذا آپ ﷺ کے اصل مقام وعظمت کو تو صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے کہ :

یَا صَاحِبَ الْجَمَالِ وَیَا سَیِّدَ الْبَشَر
مِنْ وَجْهِکَ الْمُنِیْرِ لَقَدْ نُوِّرَ الْقَمَر
لَا یُمْکِنُ الثَّنَاءُ کَمَا کَانَ حَقُّهٗ
بعد از خدا بزرگ توئی قِصّہ مختصر

اور بقول غالب :

غالب ثنائے خواجہ بیزداں گزاشتیم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است!

ہمارے لیے آپ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں ہدیۂ عقیدت پیش کرنے کا سب سے عظیم ذریعہ یہ ہے کہ ہم کثرت سے آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر درود وسلام بھیجتے رہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِکَتَهٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ؕ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۵۶﴾ ﴾(الاحزاب)

''اللہ اور اُس کے فرشتے نبی اکرم ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ مومنو! تم بھی اُن ﷺ پر درود بھیجو اور ایسے سلام بھیجا کرو جیسے سلام بھیجنے کا حق ہے''۔

سیرت پر گفتگو کے حوالے سے ہماری اصل توجہ عملی پہلو پر ہونی چاہیے۔ جو شخص عملی طور پر آپ ﷺ کی سنتِ مؤکدہ پر کاربند نہیں ہوتا تو اُس کے لیے وعید ہے :

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ)) (بخاری ومسلم)

''جس نے جان بوجھ کر میری سنت کو ترک کیا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔

☆ قرآنِ حکیم میں سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے عملی رہنمائی :

قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے عملی رہنمائی بیان کی گئی ہے۔ اِنھی میں سے ایک اہم مقام سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ ہے۔

☆ آیت کا پس منظر : سورۃ الاعراف آیات ۱۵۵۔۱۵۶ میں مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بارگاہِ خداوندی میں اپنی قوم کے لیے دعا کرتے ہیں کہ:

﴿اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ۝۱۵۵ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَا اِلَيْكَ﴾

''(اے اللہ) تو ہی ہمارا کارساز ہے' پس ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔ اور ہمارے لیے مقدر فرما دے بھلائی دنیا و آخرت میں' بلاشبہ ہم تیری ہی طرف رجوع کرنے والے ہیں''۔

اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اِس دعا کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾

''اور میری رحمت ہر شے پر چھائی ہوئی ہے''۔

بلاشبہ ہر مخلوق پر اللہ کی ایسی بیش بہا نعمتیں ہیں کہ ہم اُن کا شمار نہیں کر سکتے :

﴿وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا﴾(ابرٰھیم : ٣٤)

''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو گن نہ سکو گے''۔

یہی الفاظ سورۃ النحل کی آیت ١٨ میں بھی آئے ہیں۔

بقول شیخ سعدیؒ ہمارے لیے ہر سانس پر اللہ کے حضور دو شکر واجب ہیں۔ ایک اِس نعمت پر کہ زہریلی گیس باآسانی جسم سے خارج ہوگئی اور دوسرے یہ کہ تازہ ہوا سہولت سے جسم میں داخل ہوگئی۔ اپنی رحمت کی وسعت کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ۝۱۵۶ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾

''میں بالخصوص اِسے (یعنی رحمت کو) لکھ دوں گا اُن لوگوں کے لیے جو پرہیز کریں گے (میری) نافرمانی سے' ادا کریں گے زکوٰۃ اور ایمان رکھیں گے ہماری آیتوں پر۔ جو پیروی کریں گے رسول (ﷺ) کی جو نبی اُمّی ہیں' جن (کے ظہور کی خبر) کو وہ تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے''۔

گویا اللہ کی رحمتِ خاص اُن لوگوں کے لیے ہے جو :

١) جو تقویٰ کی روش اختیار کریں۔ یعنی اخلاصِ نیت کے ساتھ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچیں۔

۲) اللہ کی خوشنودی کے حصول کے لیے زکوٰۃ دیں، یعنی مال خرچ کریں۔

۳) آیاتِ الٰہی پر ایمان رکھیں جو متذکرہ بالا مالی وبدنی عبادت پر دوام کا ذریعہ ہیں۔

۴) رسول ﷺ کی اتباع کریں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ سے قبل بھی کئی رسول بھیجے لیکن لفظِ رسول کا کامل اطلاق آپ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر ہوتا ہے۔ آپ ؐ سے قبل رسول کسی خاص قوم کی طرف اور کسی خاص دور کے لیے تھے لیکن آپ ؐ کی رسالت تمام نوعِ انسانی کی طرف اور رہتی دنیا تک کے لیے ہے :

﴿قُلْ یٰاَیُّـهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا......﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

''(اے نبی ؐ) کہہ دیجئے کہ اے لوگو! بلاشبہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں''۔

ہر نبی کا کوئی خاص لقب ہے جیسے **اٰدمُ صفیُّ اللّٰہِ، نوحٌ نجیُّ اللّٰہِ، ابراھیمُ خلیلُ اللّٰہِ، اسمٰعیلُ ذبیحُ اللّٰہِ، موسٰی کلیمُ اللّٰہِ، عیسٰی روحُ اللّٰہِ** لیکن نبی اکرم ﷺ کا لقب ہے **محمدٌ رسولُ اللّٰہِ** (الفتح: ۲۹)۔ اِس نکتہ کی تفصیل آیت ۱۵۷ کے تحت آرہی ہے۔

☆ آیت: ۱۵۷ ﴿اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ﴾ ''جو اتباع کریں رسول ﷺ کی''۔

نبی اکرم ﷺ کی اتباع، اللہ کی رحمتِ خاص کے حصول کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ اِس کی وجہ سے انسان کو قرآنِ کریم سے نعمتِ ہدایت بھی حاصل ہوتی ہے :

﴿وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّکُمْ تَهْتَدُوْنَ﴿۱۵۸﴾﴾ (الاعراف)

''اور اُن ﷺ کی اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پا سکو''۔

اور اتباعِ نبوی ﷺ کے ذریعے بندے کو اللہ کی محبت اور گناہوں پر بخشش بھی ملتی ہے :

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ط وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴿۳۱﴾﴾ (آلِ عمران)

''(اے نبی ؐ!) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا''۔

اتباع سے مراد ہے احکامات کا انتظار کیے بغیر دلی محبت کے ساتھ پیروی کرنا۔ یعنی زندگی کے ہر معاملے میں نبی اکرم ﷺ کی پسند و ناپسند کا خیال رکھنا اور تمام امور حتی کہ معمولاتِ زندگی میں بھی آپ ﷺ کی ہر ہر ادا کی پیروی کرنا۔

اتباع = اطاعت + محبت

اتباعِ نبوی ﷺ کا پہلا جزو ہے آپ ﷺ کی اطاعت۔ قرآنِ حکیم میں گیارہ بار اللہ کی اطاعت کے ساتھ رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم وارد ہوا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :

﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾(النساء : ٦٤)

''اور ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اِس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے''۔

اللہ کی اطاعت' رسول ﷺ کی اطاعت کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء : ٨٠)

''جس نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اُسی نے اللہ کی اطاعت کی''۔

فرمانِ نبوی ﷺ ہے :

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ' وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ))

(بخاری و مسلم)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی''۔

اتباعِ نبوی ﷺ کا دوسرا جزو ہے آپ ﷺ سے دلی محبت۔ حدیثِ مبارکہ ہے :

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ)) (بخاری و مسلم)

''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اُس کے لیے اُس کے والد' اُس کے بیٹے اور تمام انسانوں سے محبوب تر نہ ہو جاؤں''۔

نبی اکرم ﷺ کی دو شانیں :

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ﴾

''جو پیروی کریں گے (ہمارے) رسولؐ کی جو نبی اُمی ہیں' جن (کے ذکرِ مبارک) کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں''۔

آیت کے اِس حصے میں نبی اکرم ﷺ کی دو شانیں بیان ہو رہی ہیں' یعنی آپ ﷺ اُمی ہیں اور آپ ﷺ کا ذکرِ مبارک تورات اور انجیل میں بھی موجود ہے۔

اُمّی کا مفہوم :

اُمّی کے لفظی معنی اَن پڑھ کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۷۸ میں ارشاد ہوا :

﴿مِنۡهُمۡ اُمِّيُّوۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ الۡكِتٰبَ﴾

''اُن میں کچھ اَن پڑھ ہیں جو کتاب کا علم نہیں رکھتے''۔

اُمّی ہونا کسی انسان کے لیے کوئی خوبی نہیں بلکہ ایک عیب سمجھا جاتا ہے، مگر رسولِ کریم ﷺ کے لیے یہی لفظ ایک بہت بڑی صفتِ کمال کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے مظاہر یہ ہیں :

۱) آپ ﷺ کی عمر شریف کے چالیس سال مکہ مکرمہ میں سب کے سامنے اِس طرح گزرے کہ کسی سے نہ ایک حرف پڑھا نہ سیکھا۔ چالیس سال کی عمر ہونے پر یکا یک آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر وہ کلام جاری ہوا جس کے ایک چھوٹے سے حصے کی مثال پیش کرنے سے بھی عرب کے بڑے بڑے خطیب اور شاعر عاجز ہو گئے۔ گویا اُمی ہوتے ہوئے آپ ﷺ کا قرآن پیش کرنا آپ کے ''رسول اللہ'' ہونے اور قرآن کے ''کلامِ الٰہی'' ہونے پر ایک بہت بڑی شہادت ہے۔

۲) اگر آپ ﷺ دنیا میں کسی انسان سے کوئی علم سیکھتے تو وہ انسان استاد ہونے کے ناطے آپ ﷺ پر ایک اعتبار سے فضیلت حاصل کرتا اور یہ بات اُس حکمتِ خداوندی کے خلاف ہوتی جس کے تحت اللہ نے آپ ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی ہے۔

۳) آپ ﷺ تاریخِ انسانی میں وہ واحد ہستی ہیں جو شاگرد نہیں بنی لیکن معلم بن گئی۔ انسانیت کو آپ ﷺ نے ایسے بیش بہا علوم اور بے نظیر حقائق و معارف کی تعلیم دی کہ آپ ﷺ کا ایک اُمّی محض ہونا ایک ایسا کھلا ہوا معجزہ بن گیا ہے جس کا اعتراف کرنے پر آپ ﷺ کے مخالفین بھی مجبور ہو گئے۔

تورات میں آپ ﷺ کا ذکرِ مبارک :

''اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری اِن

باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا''۔
(استثنا' ب۱۸ : ۱۵-۱۹)

''خدا سینا سے آیا اور شعیر سے اُن پر طلوع ہوا' فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی''۔ (استثنا' ب۳۳:۲)

''دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا ہوں' بڑا برگزیدہ ہے جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اِس پر رکھی' وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا' اُس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا''۔
(یسعیاہ' ب۴۲ : ۱-۲)

انجیل میں آپ ﷺ کا ذکرِ مبارک :

''یسوع نے اُن سے کہا کہ کیا تم نے کتابِ مقدس میں نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہوگیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اِس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اُس قوم کو جو اِس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اُس پتھر پر گرے گا اُس کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اُسے پیس ڈالے گا''۔
(متی' ب۲۱ : ۴۲-۴۴)

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے''۔ (یوحنا' ب۱۴ : ۱۷)

''اِس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیوں کہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اُس کا کچھ نہیں''۔ (یوحنا' ب۱۴ : ۳۱)

اتباعِ نبوی ﷺ کے لیے تین اہم امور:

سورۃ الاعراف کی متذکرہ بالا آیت میں مزید ارشاد ہوا:

﴿يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾

''وہ اُنہیں نیک کام کا حکم دیتے ہیں اور بُرے کام سے روکتے ہیں اور پاک چیزوں کو

اُن کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں اور اتارتے ہیں اُن (کے سر اور گردن) پر سے بوجھ اور طوق''۔

آیت کے اس حصہ میں اتباعِ نبوی ؐ کے لیے تین اہم امور بیان کیے جا رہے ہیں :

۱) امر بالمعروف ونہی عن المنکر

۲) حلال وحرام کی تمیز

۳) مشرکانہ وجاہلانہ عقائد واعمال سے اجتناب

(۱) امر بالمعروف ونہی عن المنکر : امر بالمعروف ونہی عن المنکر یا دعوت الی اللہ کے فریضہ کو اتباعِ نبوی ﷺ سے خاص تعلق ہے۔ سورہ ٔ یوسف آیت ۱۰۸ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ﴾

''کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے کہ میں دعوت دوں اللہ کی طرف۔ میں یہ کام پورے شعور سے کر رہا ہوں اور وہ بھی جو میری اتباع کرتا ہے''۔

قرآنِ حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دس مقامات پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ اُن میں سے ایک اہم مقام سورہ ٔ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ ہے جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو اِس امت کا مقصد اور فرضِ منصبی قرار دیا گیا :

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ﴾

''تم بہترین اُمت ہو جسے اللہ نے لوگوں کی رہنمائی کے لیے اٹھایا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''۔

اگر امت اِس ذمہ داری سے پہلو تہی کرے گی تو گویا اپنے مقصد کو چھوڑ دے گی اور اللہ کی طرف سے سزا کی مستحق ٹھہرے گی۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَتَاْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ اَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْهُ، ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ)) (جامع الترمذی)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ضرور کرو، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی طرف سے عذاب برپا کرے گا'

اِس کے بعد تم اُس سے دُعا کرو گے تو تمہاری دُعا قبول نہ ہوگی''۔

اگر امت بحیثیتِ مجموعی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے غافل ہو تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اِس کے لیے رہنمائی ہے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۰۴ میں :

﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

''تم میں سے ایک جماعت تو لازماً ایسی ہونی چاہیے جو خیر کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔

اِس آیت کی رو سے فلاحِ اخروی کے حصول کے لیے ہمیں کسی ایسی اجتماعیت میں شامل ہونا چاہیے جو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہو۔

(۲) حلال وحرام کی تمیز: نبی اکرم ﷺ نے قرآنِ حکیم اور اپنے ارشادات کے ذریعے ہمیں مال، خوراک، لباس اور جنسی جذبات کی تسکین کے حوالے سے حلت وحرمت کے احکامات دیے ہیں۔ آپ ﷺ کی اتباع کا تقاضا ہے کہ ہم اِن احکامات کی سختی سے پابندی کریں۔

مال اور خوراک کے حوالے سے ارشاداتِ باری تعالیٰ ہیں :

﴿ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾(البقرۃ : ۱۸۸)

''اور باہم ایک دوسرے کے مال باطل طریقے سے نہ کھاؤ''۔

اِس سے مراد ہے مال اِس طرح کمانا کہ کسی اور کا حق نہ مارا جائے، کسی فرد یا ملک وملت کا نقصان نہ ہو اور کسی کی مجبوری یا لاعلمی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھایا جائے۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾(طٰہٰ :۸۱)

''کھاؤ اُن پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں''۔

طیب سے مراد ہے وہ شے جسے اللہ نے حلال کیا، جس میں کسی شرک کی آمیزش نہ ہو، جس کے حصول میں کوئی حرام، گناہ یا کسی غلط کام سے تعاون کا عنصر شامل نہ ہو۔ جو لوگ مال یا خوراک کے حوالے سے حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے اُن کی کوئی عبادت یا دعا قبول نہیں ہوتی۔ حدیثِ نبویؐ ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى طَيِّبٌ لَّا يَقْبَلُ اِلَّا طَيِّبًا، وَاِنَّ اللّٰهَ اَمَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ بِمَا اَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِيْنَ، فَقَالَ تَعَالٰى: يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا

صَالِحًا. وَقَالَ تَعَالٰی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ : يَارَبِّ يَارَبِّ، وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ، وَغُذِيَ بِالْحَرَامِ، فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لَهُ!)) (مسلم)

''بے شک اللہ تعالیٰ پاک ہے اور وہ پاکیزہ چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ بے شک اللہ نے ایمان والوں کو بھی اُس چیز کا حکم دیا ہے جس کا اپنے رسولوں کو حکم فرمایا: اے میرے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ اور فرمایا: اے ایمان والو! اُس پاکیزہ رزق میں سے کھاؤ جو ہم نے تمہیں دیا۔ پھر رسول اکرم ﷺ نے ایک ایسے آدمی کی مثال بیان کی جس نے لمبا سفر کیا' اُس کے بال پراگندہ ہیں' چہرہ غبار آلود ہے' اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتا ہے اور کہتا ہے اے رب! اے رب! لیکن ایسے شخص کی دعا اللہ کے ہاں کیسے قبول ہوگی؟ جس کا کھانا' پینا اور لباس حرام کمائی کا ہو اور جس کی پرورش بھی حرام مال سے ہوئی ہو''۔

دنیا میں ایسے لوگ قلبی سکون اور چین سے محروم ہو جاتے ہیں اور آخرت میں جنت سے محروم اور جہنم کا شکار ہو جائیں گے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اَلنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ))(مسند احمد)

''جنت میں داخل نہ ہوگا وہ گوشت جس نے حرام کمائی سے پرورش پائی ہے۔ وہ جہنم ہی میں جانے کا حق دار ہے''۔

لباس کے حوالے سے درجِ ذیل امور کا خیال رکھنا چاہیے:

۱) لباس ساتر ہو' یعنی انسان کے ستر کو ڈھانپ دے اور ایسا باریک نہ ہو کہ پہننے کے باوجود جسم کے پوشیدہ حصوں کے خدوخال نمایاں ہو رہے ہوں۔

۲) لباس میں اسراف یا تبذیر نہ ہو۔

۳) لباس متکبرانہ نہ ہو اور نہ ہی زمین پر گھسٹ رہا ہو۔

۴) خواتین مردانہ لباس نہ پہنیں اور مرد خواتین کا سا لباس نہ پہنیں۔

۵) غیر مسلم قوموں کے لباس کی نقالی نہ کی جائے۔

۶) مرد ریشمی لباس اور سونے کے زیورات سے اجتناب کریں۔

۷) خواتین محرم مردوں کے سامنے ستر کا اور نامحرم مردوں کے سامنے حجاب کا اہتمام کریں۔
جنسی جذبات کی تسکین کے حوالے سے سورۃ النساء آیت ۲۳ میں محرمات کی فہرست دے دی گئی اور بتا دیا گیا کہ اِن کے علاوہ دیگر خواتین سے بذریعہ نکاح تعلق قائم کیا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اِن حدود و قیود کی پابندیاں نہ کریں اُن کے بارے میں وعید ہے :

﴿ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (المؤمنون)

''اور جو لوگ (جنسی تسکین کے لیے) اِس کے سوا کوئی اور راہ اختیار کریں گے وہی لوگ حد سے نکلنے والے ہیں''۔

ایسے لوگوں کے لیے سورۃ النور آیت ۱۹ میں ارشاد ہے :

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَۃُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ﴾

''بلاشبہ جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان میں فحاشی پھیلے اُن کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے''۔

(۳) مشرکانہ و جاہلانہ عقائد و اعمال سے اجتناب: اتباعِ نبوی ﷺ کا تیسرا گوشہ ہے اُن بوجھوں سے خود کو اور نوعِ انسانی کو آزاد کرانا جو مشرکانہ عقائد و اوہام، بدعات اور رسومات کی صورت میں وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ مشرکانہ عقائد کی وجہ سے لوگوں کو کیسی شدید جسمانی مشقتیں اور مالی نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ مشرکانہ اوہام کی وجہ سے معبودانِ باطل یا دیگر اسبابِ دنیوی کا خوف طاری ہوتا ہے اور بعض اوقات اُس کے لیے مال، اولاد اور مویشیوں کی بھینٹیں چڑھانی پڑتی ہیں۔ خوشی کے موقع پر رسومات کے طومار اور غمی کے موقع پر بدعات کی وجہ سے غریبوں کا جینا دوبھر ہو جاتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ اگر آپ ﷺ کی تعلیمات اور سنتوں پر عمل کیا جائے تو اِن بوجھوں اور گردن کے طوقوں سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے تعلق کی چار بنیادیں

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَہٗٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۵۷﴾

''تو جو لوگ اُن پر ایمان لائے اور اُن کی توقیر و تعظیم کی اور اُن کی مدد کی اور جو نور اُن

کے ساتھ نازل ہوا ہے اُس کی پیروی کی، وہی کامیاب ہونے والے ہیں''۔

سورۃ الاعراف آیت ۱۵۷ کے اِس آخری حصے میں نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی چار بنیادیں بیان کی گئی ہیں:

۱) آپ ﷺ پر ایمان لانا۔

۲) آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کرنا۔

۳) آپ ﷺ کی نصرت و حمایت کرنا۔

۴) آپ ﷺ کے ساتھ نازل ہونے والے نور یعنی قرآنِ کریم کی پیروی کرنا۔

تعلق کی پہلی بنیاد : ایمان

نبی کریم ﷺ پر ایمان سے مراد ہے اِس بات کا اقرار و یقین کہ :

- آپ ﷺ اللہ کے آخری نبی اور رسول ہیں۔
- آپ ﷺ کی رسالت قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی طرف ہے۔
- آپ ﷺ کی رسالت رہتی دنیا تک ہے۔
- آپ ﷺ پر اللہ کا آخری کلام قرآنِ مجید نازل ہوا جو ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے۔

ایمان کے دو درجات ہیں :

(۱) اِقْرَارٌ بِاللِّسَان (۲) تَصْدِيْقٌ بِالْقَلْب (ایمان مجمل)

اگر صرف زبان سے اقرار ہے اور دل سے یقین نہیں تو یہ نفاق ہے۔ منافقین کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ﴾ (المائدۃ : ٤١)

''وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے لیکن اُن کے دل ایمان نہیں لائے''۔

اگر صرف دل میں یقین ہے اور زبان سے اقرار نہیں تو یہ کفر ہے۔ فرعون اور اُس کے سرداروں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ﴾ (النمل : ١٤)

''اُنہوں نے انکار کیا (معجزات کا) جبکہ اُن کے جی یقین کر چکے تھے''۔

دنیا میں قانونی طور پر مومن ہونے کی بنیاد زبان سے اقرار ہے :

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا﴾ (النساء :٩٤)
''اور نہ کہو اُس کو جو تمہیں سلام پیش کرے کہ تم مؤمن نہیں ہو''۔

آخرت میں حقیقی مومن قرار پانے کے لیے زبانی اقرار کے ساتھ دل والا یقین بھی ضروری ہے۔ منافقین نبی اکرم ﷺ کے پیچھے نمازیں پڑھنے کے باوجود جہنم کے سب سے نچلے درجے میں ہوں گے۔

﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ (النساء : ١٤٥)
''بے شک منافقین جہنم کے سب سے نچلے گڑھے میں ہوں گے''۔

اُمت کی موجودہ زبوں حالی اِس بات پر گواہ ہے کہ ہماری اکثریت ایمانِ حقیقی سے محروم ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٩﴾ ﴾ (آلِ عمران)
''تم ہی غالب ہو گے بشرطیکہ مؤمن ہو''۔

ایمانِ حقیقی سے ہماری محرومی پر ایک اور دلیل ہماری اکثریت کی بے عملی بھی ہے کیونکہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے :

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِهٖ)) (رواہ البیہقیؒ)
''تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی خواہشِ نفس اُس شریعت کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں''۔

تعلق کی دوسری بنیاد: توقیر و تعظیم

نبی اکرم ﷺ پر ایمان کا فطری و لازمی تقاضا ہے کہ آپ ﷺ کی توقیر و تعظیم کی جائے یعنی آپ ﷺ سے حد درجہ محبت کی جائے اور آپ ﷺ کا ادب و احترام کیا جائے۔ سورۃ الحجرات آیت ۲ میں فرمایا گیا :

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿٢﴾ ﴾
''مؤمنو! اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز پر بلند نہ کرو اور اُنؐ کے سامنے اِس طرح اونچی آواز میں گفتگو نہ کرو جس طرح آپس میں کرتے ہو، مبادا تمہارے سارے اعمال برباد

ہو جائیں اور تمہیں خبر تک نہ ہو'۔

اگر محض آواز بلند کرنے پر اعمال ضائع ہونے کا اندیشہ ہے تو اندازہ کیجئے نبی ﷺ کی حکم عدولی اور نافرمانی پر کتنا عظیم خسارہ ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یَوْمَئِذٍ یَّوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰی بِھِمُ الْاَرْضُ﴾
(النساء: ٤٢)

''اُس روز چاہیں گے کافر اور وہ لوگ جنہوں نے رسول ﷺ کی نافرمانی کی کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اُس میں سما جائیں''۔

تعلق کی تیسری بنیاد: نبی اکرم ﷺ کی نصرت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نصرت کس کام اور کس مقصد کے لیے کی جائے؟

۱) دعوتِ دین کے لیے، یعنی نوعِ انسانی کو جہنم کی آگ سے بچانے کے لیے۔ اللہ کے رسول ﷺ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں:

((اِنَّمَا مَثَلِیْ وَمَثَلُ اُمَّتِیْ کَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَوْقَدَ نَاراً، فَجَعَلَتِ الدَّوَابُّ وَالْفَرَاشُ یَقَعْنَ فِیهِ، فَاَنَا آخِذٌ بِحُجَزِکُمْ، وَاَنْتُمْ تَقَحَّمُوْنَ فِیهِ)) (مسلم)

''بے شک میری مثال اور میری امت کی مثال ایسے ہے جیسے ایک شخص جس نے آگ جلائی، پھر کیڑے اور پتنگے اُس میں گرنے لگے، پس میں تمہیں کمر سے پکڑ پکڑ کر بچانے والا ہوں اور تم اُس (جہنم کی آگ) میں گرتے پڑتے ہو''۔

۲) اقامتِ دین کے لیے، یعنی نوعِ انسانی کو ظالمانہ نظام سے بچانے کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾

(التوبۃ: ۳۳، الفتح: ۲۸، الصف: ۹)

''وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول ﷺ کو کامل ہدایت اور سچے دین کے ساتھ تاکہ وہ اُسے غالب کر دیں کل نظامِ زندگی پر''۔

ختم نبوت کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ کے ذمہ صرف دین کی دعوت ہی نہیں بلکہ اسلام کے عادلانہ نظام کو بالفعل قائم کرنا بھی تھا۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ﴾ (الشوریٰ: ۱۵)

''اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں''۔

دعوتِ دین کا کام نسبتاً آسان ہے لیکن اقامتِ دین کا کام مشکل ہے۔ عادلانہ نظام کا قیام بغیر تصادم کے ناممکن ہے:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾﴾ (الحدید)

''بلاشبہ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو (نظامِ عدل) اُتارا تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا بھی اُتارا ہے جس میں شدید جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے دیگر فائدے بھی ہیں' تاکہ اللہ ظاہر کردے کہ کون غیب میں رہتے ہوئے اللہ اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ بے شک اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے''۔

نصرتِ رسول ﷺ کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا ایک بڑا پیارا اور خاص طور پر ہمارے لیے انتہائی امید افزا ارشاد ہے جو علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے درِّ منثور میں مسندِ ابن ابی شیبہ سے نقل کیا ہے :

((يَا لَيْتَنِيْ قَدْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ!)) قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ أَلَسْنَا اِخْوَانَكَ وَ اَصْحَابَكَ؟ قَالَ: ((بَلٰى، وَلٰكِنَّ قَوْمًا يَجِيْئُوْنَ مِنْ بَعْدِكُمْ، يُؤْمِنُوْنَ بِيْ اِيْمَانَكُمْ، وَيُصَدِّقُوْنِيْ تَصْدِيْقَكُمْ، وَيَنْصُرُوْنِيْ نَصْرَكُمْ، فَيَالَيْتَنِيْ قَدْ لَقِيْتُ اِخْوَانِيْ))

''اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے! صحابہؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ﷺ کیا ہم آپ ﷺ کے بھائی اور ساتھی نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: کیوں نہیں! لیکن یہ وہ لوگ ہوں گے جو تمہارے بعد آئیں گے' مجھ پر ایسے ایمان لائیں گے جیسے تم ایمان لائے ہو اور میری اُسی طرح تصدیق کریں گے جیسے تم نے کی ہے اور اُسی طرح میری مدد کریں گے جیسے تم نے کی ہے' تو اے کاش میں ملتا اپنے بھائیوں سے''۔

گویا ہمارے لیے نبی اکرم ﷺ کی نصرت کے دو میدان ہیں :

(۱) دعوتِ دین : نوعِ انسان آج بھی ہدایت ربانی کی محتاج ہے' لہٰذا خیر کی دعوت

دینا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنا ہمارے ذمہ ہے۔

(۲) اقامتِ دین: اسلام کے عادلانہ نظام کے قائم نہ ہونے کی وجہ سے نوعِ انسانی ظلم کا شکار ہے۔ لہٰذا عدل کا علمبردار بن کر کھڑا ہونا ہماری ذمہ داری ہے۔ حکمِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء: ۱۳۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، کھڑے ہو جاؤ عدل کے علم بردار بن کر اللہ کے لیے گواہ ہوتے ہوئے''۔

دعوتِ دین اور اقامتِ دین کا کام متفقہ سنت نبوی ﷺ ہے۔ آغازِ بعثت سے آخری سانس تک آپ ﷺ نے مسلسل اور متواتر یہ کام جاری رکھا۔

نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے جان نثار ساتھیوں نے بڑی پامردی سے دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کی اور مختصر وقت میں دنیا کے بڑے حصّے میں اسلام کا عادلانہ نظام غالب کر دیا، لیکن رفتہ رفتہ ہماری کوتاہی سے اب یہ کیفیت ہے کہ بقول مولانا الطاف حسین حالی: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اور: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغرباء ہے!

دعوتِ دین اور اقامتِ دین کے حوالے سے نبی اکرم ﷺ کا مشن تا قیامِ قیامت زندہ ہے اور اِس کارِ رسالت کی انجام دہی کی ذمہ داری اب امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرة: ۱۴۳)

''اور اِسی طرح ہم نے بنایا تمہیں درمیانی اُمت تاکہ تم گواہ بن جاؤ لوگوں پر اور رسول ﷺ گواہ بن جائیں تم پر''۔

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے!

اتباعِ نبوی ﷺ کا اصل تقاضا یہ ہے کہ اپنی جان' مال' اوقات اور صلاحیتوں کو دعوتِ دین اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں کھپایا جائے۔ گویا ؎

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اِسی لیے مسلماں' میں اِسی لیے نمازی!

تعلق کی چوتھی بنیاد: اتباعِ قرآنِ حکیم :

- نبی اکرم ﷺ کے بعد ابدالآباد تک نبوت کا قائم مقام قرآنِ حکیم ہے۔
- قرآنِ حکیم ہمارے پاس نبی اکرم ﷺ کی نشانی اور امانت ہے۔
- خطبۂ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((وَقَدْ تَرَكْتُ فِيْكُمْ مَا لَنْ تَضِلّوا بَعْدَهُ اِنِ اعْتَصَمْتُمْ بِهٖ : كِتَابُ اللّٰهِ))

''میں تمہارے درمیان ایسی شے چھوڑے جا رہا ہوں کہ جب تک تم اِس سے چمٹے رہے کبھی گمراہ نہ ہوگے' (وہ ہے) اللہ کی کتاب (قرآن کریم)''۔ (مسلم)

- قرآنِ حکیم کی اتباع سے مراد ہے قرآنِ حکیم کے پانچ حقوق کی ادائیگی :
  ۱) قرآنِ حکیم پر قلبی یقین والا ایمان رکھنا۔
  ۲) قرآنِ حکیم کی پیروی کی نیت سے تلاوت کرنا۔
  ۳) قرآنِ حکیم کو اپنی صلاحیت کے مطابق سمجھنا۔
  ۴) قرآنِ حکیم پر عمل کرنا اور اِس کے اجتماعی احکامات کے نفاذ کے لیے کوشش کرنا۔
  ۵) قرآنِ حکیم کی تعلیمات دوسروں تک پہنچانا۔
- قرآنِ حکیم کے ساتھ ہمارے تعلق کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے :

يَا اَهْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ' وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ ' وَافْشُوْهُ وَ تَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (رواہ البیھقی)

''اے قرآن والو! قرآن کو تکیہ اور سہارا نہ بناؤ' بلکہ رات اور دن کے اوقات میں اس

کی تلاوت کیا کرو جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو پھیلاؤ اور اس کو خوش الحانی سے پڑھا کرو اور اس میں غور و فکر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔

قرآن کریم کے اصل حقوق ادا کرنے کے بجائے اِس سے ہمارے موجودہ تعلق کی کیفیت یہ ہے کہ اِسے :

- ریشمی جزدان میں لپیٹ کر رکھنا۔
- بچیوں کو جہیز میں دینا۔
- مرنے والے کے سرہانے پڑھنا۔
- عدالتوں میں قسم کھانے کے لیے استعمال کرنا۔
- کسی فیصلہ کے وقت فال کھولنے کے لیے استعمال کرنا۔
- آفات اور بلاؤں سے محفوظ رہنے کے لیے پڑھنا۔
- حسنِ قراءت کی محافل منعقد کرنا۔
- حصولِ ثواب اور ایصالِ ثواب کی غرض سے تلاوت کرنا۔
- قرآنِ حکیم سے صحیح تعلق استوار نہ کرنا ہی ہمارے زوال کا سبب ہے۔ حدیثِ مبارکہ ہے :

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ))(مسلم)

'' اللہ اِس کتاب کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و عروج عطا فرمائے گا اور (اِسے ترک کر دینے کی وجہ سے) دوسروں کو ذلت سے دوچار فرمائے گا''۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہوکر

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اُمت کے زوال کے دو اسباب ہیں:

(۱) قرآن کو چھوڑ دینا (۲) آپس کے اختلافات

صاحبِ معارف القرآن مفتی محمد شفیعؒ صاحب شیخ الہندؒ کی رائے پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زوالِ امت کا صرف ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے قرآن کو چھوڑ دینا' کیوں کہ آپس کے اختلافات بھی قرآن کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہی ہیں۔

(وحدتِ اُمت' تالیف مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

خلاصۂ کلام

نبی کریم ﷺ سے تعلق اِن چار بنیادوں یعنی ایمان، توقیر و تعظیم، نصرت اور اتباعِ قرآن کریم کے ذریعے سے صحیح طور پر استوار ہوگا اور آخرت کی کامیابی کے دروازے کھلیں گے۔

☆ نبی کریم ﷺ سے ہمارے تعلق کی موجودہ کیفیت :

- فرائض سے پہلوتہی
- اوامر و نواہی کی پرواہ نہیں
- چراغاں، جھنڈوں / جھنڈیوں کے ذریعے تبذیر اور وسائل کا ضیاع
- اکثر و بیشتر چوری کی بجلی سے چراغاں
- شاندار جلسے و جلوس

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((مَا مِنْ نَّبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِي أُمَّتِهٖ مِنْ قَبْلِي اِلَّا كَانَ لَهٗ فِي أُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ وَ اَصْحَابٌ يَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَ يَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَّقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ وَ يَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَ هُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَ لَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ مسلم)

''اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے کسی امت میں کوئی نبیؑ نہیں بھیجا مگر یہ کہ اُس کے کچھ حواری اور صحابی ہوتے تھے جو اُس نبیؑ کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اُس کے احکامات کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اِن کے بعد اُن کے جانشین ایسے لوگ بن جاتے ہیں جو کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں، اور کرتے وہ ہیں جس کا حکم ہی نہیں دیا گیا۔ تو جو کوئی اُن سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مؤمن شمار ہوگا، اور جو کوئی اُن سے زبان سے جہاد کرے گا وہ مؤمن شمار ہوگا، اور جو کوئی اُن سے دل سے جہاد کرے گا وہ مؤمن شمار ہوگا۔ اور اِس کے بعد تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں''۔

اِس وقت دنیا میں جگہ جگہ مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم کا بازار گرم ہے اور اُن کی جانیں، مال اور عصمتیں پامال کی جارہی ہیں۔ بقول اقبال :

حضورؐ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اِس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اِس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اِس میں

نبی کریم ﷺ کا لایا ہوا دین آج دنیا میں کہیں غالب نہیں اور آپ ﷺ کی امت شدید مصائب و الم سے دوچار ہے ،بقول اقبال:۔

اے بادِ صبا کملی والے سے جا کہیو پیغام مرا
قبضے سے اُمت بیچاری کے دیں بھی گیا دنیا بھی گئی

اور ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم آزادی، میلاد، شبِ براءت وغیرہ کے حوالے سے جشن مناتے رہتے ہیں۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی اکرم ﷺ سے صحیح تعلق اُستوار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

❁❁❁

رِفق و ملاطفت

داعیٔ مکرم ﷺ کے اُسوۂ کامل کا ایک ورق

عتیق الرحمٰن صدیقی

اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے ایک نام لطیف بھی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ نے سات مقامات پر اپنے لیے ''لطیف'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ نے اس کے ایک معنی یہ بیان کیے ہیں کہ ''وہ انسانوں کو ہدایت دینے میں نرم انداز اختیار کرتا ہے''۔ قرآن میں ہے: ﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ﴾ (الشوریٰ: ۱۹) ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔'' اور آیت کریمہ ﴿اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ﴾ (یوسف: ۱۰۰) ''بے شک میرا ربّ جو کچھ چاہتا ہے حسن تدبیر سے کرتا ہے'' میں لطیف سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کام کو حسنِ تدبیر سے سرانجام دیتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے کنویں میں ڈال دیا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے انہیں عظیم مرتبہ تک پہنچا دیا۔ اور کبھی ان تحائف کو بھی لطف کہا جاتا ہے جو دوستی بڑھانے کے لیے ایک دوسرے کو دیے جاتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ((تَهَادَوْا تَحَابُّوْا)) (۱) ''ایک دوسرے کو تحفے بھیجا کرو، تمہاری آپس میں محبت بڑھ جائے گی''۔ اَلْطَفَ فُلَانٌ اَخَاهُ بِكَذَا ''فلاں نے اپنے بھائی کے ساتھ کسی چیز کے ذریعے حسن سلوک کیا''۔ (مفردات القرآن، جلد دوم)

لطف کا ہم معنی لفظ رفق بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سختی کے بجائے ملائمت اور نرمی اختیار کی جائے، دوسرے کو بات نرمی سے سمجھائی جائے اور کسی سے اگر کوئی مطالبہ کیا جائے تو وہ بھی دلوں کو موہ لینے والے انداز سے کیا جائے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں:

> ''خدا کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح و نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے۔ لطیف اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے، ان کے ساتھ اس طرح لطف فرماتا ہے جس کا علم بھی

(۱) موطا مالك، كتاب الجامع، باب ما جاء فی المهاجرة۔

ان کو نہیں ہوتا اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا ..... ابن الاعرابی کا قول ہے: لطیف وہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت سے پہنچا دیتا ہے''۔ (سیرت النبیؐ 'جلد ششم' بحوالہ الاسماء والصفات)

حضور نبی کریم ﷺ تمام کمالات و اوصاف کے جامع تھے۔ حضرت عائشہ ؓ کے ارشاد کی روشنی میں ''آپؐ کا اخلاق قرآن تھا''۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے خاص طور پر نرمی اور نرم خوئی کا ایک وافر حصہ آپؐ کو عطا فرمایا تھا۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو' ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔''

ایک پیغمبر کے لیے رفق و تلطف اور نرم خوئی کا وصف ناگزیر ہے۔ تبلیغ و تعلیم اور تبشیر و انذار کا عمل اسی صورت میں اثر انگیز ہوسکتا ہے جب اسلوبِ دعوت میں ملاطفت اور نرمی کا عنصر غالب ہو۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون جیسے سفاک' سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں بھیجتے وقت فرمایا گیا:

﴿ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾﴾ (طٰہٰ)

''جاؤ تم دونوں فرعون کے پاس کہ وہ سرکش ہوگیا ہے۔ اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے۔''

گویا تفہیم و تلقین اور پند و موعظت میں تلطف و ترحّم کا جذبہ اور خوش خلقی حالات کے سدھار میں ایک بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

''.....حلم و بردباری' عفو و درگزر' چشم پوشی اور خوش خلقی' غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام ہے جن میں شان جمالی پائی جاتی ہے' یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح حسن فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہوجاتا ہے اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک دفعہ حضرت عائشہ ؓ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی' فرمایا: ((اِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُوْنُ فِيْ شَيْءٍ

اِلَّا زَانَهٗ وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا شَانَهٗ))[۲] ''نرمی جس چیز میں ہو اُس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے''۔ (سیرت النبیؐ، ششم، بحوالہ صحیح مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَالَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِيْ عَلٰى مَا سِوَاهُ))[۳]

''اے عائشہ! اللہ تعالیٰ نرم ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے۔ اور وہ نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر نہیں دیتا اور نرمی کے علاوہ کسی بھی دوسری چیز پر نہیں دیتا''۔

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ ﷺ نے ان الفاظ میں بھی دی:

((اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ اَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارُ، عَلٰى كُلِّ قَرِيْبٍ هَيِّنٍ سَهْلٍ))[٤]

''کیا میں تم لوگوں کو نہ بتاؤں کہ کون شخص آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام ہے؟ ہر اُس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم خو اور آسان ہو''۔

مسند احمد کی روایت میں رسول اللہ ﷺ سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں:

((حُرِّمَ عَلَى النَّارِ كُلُّ هَيِّنٍ سَهْلٍ قَرِيْبٍ مِّنَ النَّاسِ))

''ہر اُس شخص پر آگ حرام کر دی گئی ہے جو نرم خو اور آسان ہو، لوگوں سے قریب ہو''۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی خادم کو نہیں مارا، کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھایا، جہاد فی سبیل اللہ کے سوا آپؐ نے کبھی کسی کو ہاتھ سے نہیں مارا، آپؐ نے کبھی کسی سے ایسی ایذا کا انتقام نہیں لیا جو آپؐ کو دی گئی ہو، سوائے ایسی صورت کے جب اللہ کی حرمتوں کو توڑا گیا ہو اور آپؐ نے اللہ کی خاطر اس کا بدلہ لیا ہو۔ (مسند احمد)

عام لوگوں کے لیے آپؐ کی خیر خواہی اور مؤمنوں پر آپؐ کی بے پناہ شفقت کی کیفیت

---

(۲) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق۔

(۳) صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق۔

(٤) سنن الترمذی، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول اللّٰه ﷺ، باب منه۔

کو قرآن حکیم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٢٨﴾﴾ (التوبۃ)

''تم لوگوں کے پاس تمہی میں سے ایک رسول آیا' تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے' وہ تمہاری فلاح (منفعت) کا بے حد خواہش مند ہے' اہل ایمان پر وہ نہایت شفیق اور رحیم ہے۔''

قاضی محمد سلیمان منصور پوری ﴿عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ﴾ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ''جو چیز تم کو مشقت میں ڈالنے والی ہے وہ نبیؐ کو نہایت ہی شاق اور گراں گزرتی ہے''۔ یعنی تمہاری تکلیف سے نبی ﷺ کو ضرور تکلیف ہوتی ہے' تمہارے درد کو وہ درد سمجھتے ہیں۔ واضح ہو کہ نبی اکرم ﷺ کی یہ صفت کفار اور مؤمنین دونوں کے حق میں تھی۔ (رحمۃٌ للعالمین' سوم)

نبی اکرم ﷺ کافروں کو کفر و شرک میں مبتلا دیکھ کر کڑھتے تھے کہ یہ لوگ اپنے لیے کیوں ہلاکت کا گڑھا کھود رہے ہیں۔ ایسے میں آپؐ کے رحم پرور دل کو بہت صدمہ پہنچتا تھا۔ سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا کہ ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ﴾ (آیت ۱۷۶) ''(اے نبی!) کفر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کی حالت سے آپ اندوہ گیں نہ ہوں''۔

غزوۂ بدر کے موقع پر جب کفارِ مکہ کو قید کر لیا گیا تو نبی مکرم ﷺ رات کو سو نہ سکے' آپؐ کروٹیں بدل رہے تھے اور کرب و اضطراب نمایاں تھا۔ ایک انصاری نے جب اس پریشانی کا سبب پوچھا تو آپؐ نے فرمایا کہ عباس کے کراہنے کی آواز ان کے کانوں میں آ رہی ہے' اس لیے انہیں چین نہیں آ رہا۔ انصاری چپکے سے اٹھا' اس نے عباس کی مشک بندی کھول دی' انہیں آرام ملا اور وہ سو گئے۔ آپ ﷺ نے دوبارہ انصاری سے استفسار کیا کہ اب عباس کی آواز کیوں نہیں آ رہی؟ انصاری بولا کہ اس نے ان کے بندھن کھول دیے ہیں۔ فرمایا جاؤ اور سب قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی برتاؤ کرو۔ جب نبی اکرم ﷺ کو اطلاع دی گئی کہ سب قیدی اب آرام سے ہیں تب آپؐ کا اضطراب دور ہوا اور آپؐ خواب شیریں سے استراحت گزیں ہوئے۔ یہ وہ قیدی تھے کہ انہوں نے اہل ایمان کو متواتر ستایا تھا' طرح طرح کی اذیتیں دی تھیں' اس کے باوجود آپؐ نے ''با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا'' کا رویہ اختیار کیا۔ عباس آپ ﷺ کے چچا تھے' ان کو سہولت پہنچانے کے بعد آپؐ کے عدل و انصاف نے ان میں اور دوسرے قیدیوں میں امتیاز قائم رکھنا گوارا نہ کیا۔ آپؐ کی رحم دلی اور شفقت و رأفت کا یہ

زندہ زمین میں گاڑ دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکار رہی تھی اور وہ اس پر مٹی کے ڈھیلے ڈالے جا رہا تھا۔ یہ واقعہ سن کر آنحضورﷺ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ آپﷺ نے فرمایا کہ اس قصہ کو پھر دہراؤ' صحابی نے اس دردناک ماجرے کو دوبارہ بیان کیا۔ آپؐ بے اختیار روئے' یہاں تک کہ روتے روتے محاسن مبارک تر ہو گئے۔ (مسند دارمی)

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے' ناز و نعمت میں پلے تھے' نہایت قیمتی لباس زیب تن کیے رکھتے تھے۔ ایمان لائے تو والدین کی محبت عداوت میں بدل گئی۔ ایک دفعہ حضورﷺ کی خدمت مبارک میں اس حال میں حاضر ہوئے کہ وہ جسم جو حریر و قاقم میں ملبوس رہتا تھا اس پر پیوند لگے تھے' کوئی کپڑا سالم نہ تھا۔ آپﷺ یہ پُر اثر منظر دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔ (ترغیب و ترہیب بحوالہ ترمذی)

نبی اکرمﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تلقین کرتے کہ دین میں آسانی کی راہیں اختیار کرو' اس کو مشکل نہ بناؤ اور لوگوں کے دلوں میں اس کی دہشت پیدا نہ کرو۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے نبی مکرمﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾﴾ (الاعراف) ''نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو' معروف کی تلقین کیے جاؤ اور جاہلوں سے نہ الجھو''۔

ایک دفعہ یہودیوں کی ایک جماعت رسول اللہﷺ کی خدمت اقدس میں آئی اور ''اَلسَّامُ عَلَيْكَ' کہا' یعنی ''تم پر موت آئے''۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ((عَلَيْكُمْ)) ''تم پر!'' لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ''بَلْ عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ'' ''بلکہ تم کو موت آئے اور تم پر لعنت بھی ہو''۔ رسول اللہﷺ نے سنا تو فرمایا: ((يَا عَائِشَةُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الْاَمْرِ كُلِّهٖ)) ''عائشہ (ٹھہر جاؤ!) اللہ تعالیٰ تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے''۔ بولیں یارسول اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا آپؐ نے نہیں سنا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ((قَدْ قُلْتُ عَلَيْكُمْ)) فرمایا: ''تو میں نے بھی تو کہہ دیا کہ تم پر''۔[٦] حضور نبی کریمﷺ کا جواب بھی وہی تھا' مگر ''اس کی رنجش میں بھی چاہت کا قرینہ دیکھوں'' کا بھلا انداز تھا' اس میں درشتگی اور سختی ہرگز نہ تھی۔

---

(٦) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب الرفق فی الامر كله۔ وسنن الترمذی' كتاب الاستئذان والآداب عن رسول اللّٰهﷺ۔ باب ما جاء فی التسليم على اهل الذمة۔

عالم تھا کہ جب تک سب قیدیوں کے آرام میں ہونے کی رپورٹ نہ ملی اس وقت تک آپؐ کو نیند نہ آئی۔

جب تک رسول اللہ ﷺ مکہ میں تھے تو اللہ نے اہل مکہ پر عذاب نازل نہ فرمایا باوجود اس کے کہ وہ چیلنج کے انداز میں کہتے تھے کہ اگر یہ دین' دین حق ہے تو اس کے جھٹلانے پر ان پر پتھر برسنا چاہئیں اور ان پر عذابِ الیم ٹوٹ پڑنا چاہیے' اگر ایسا نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ نہ حق ہے اور نہ من جانب اللہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں فرماتا ہے: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ۚ﴾ (الانفال:۳۳) ''اور اُس وقت تو اللہ ان پر عذاب نازل کرنے والا نہ تھا جب کہ تو ان کے درمیان موجود تھا''۔ مگر جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جا چکے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اس فرمان کا مفہوم ظاہر فرمایا اور انہیں ایسے شدید قحط کی آفت سے دوچار کیا کہ اس کی شدت سے اہل مکہ کی آنکھوں کی روشنی بھی کم ہوگئی۔ چنانچہ ابوسفیان جو اہل ایمان کی دشمنی میں پیش پیش رہتا تھا' حضور نبی کریم ﷺ کے حضور حاضر ہو کر نہایت ادب سے فریاد کناں ہوا کہ وہ ان کے قرابتی ہیں اور رحم کے ملتجی ہیں' ان پر احسان فرمائیے اور دعا کیجیے کہ اس قحطِ شدید سے ان کو نجات مل جائے۔ آپؐ نے ثمامہ بن آثال سردارِ نجد کو' جو ایمان لا چکے تھے' حکم بھیج دیا کہ وہ مکہ میں فوراً غلہ پہنچانے کا اہتمام کریں۔ اُن کے علاقہ میں اناج کثرت سے تھا۔ انہوں نے غلہ صرف اس لیے روک رکھا تھا اور تجارت کے نفع کو بھی نظر انداز کر دیا تھا کہ اہل مکہ اسلام کے دشمن ہیں' مگر اب انہوں نے آپ ﷺ کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کیا اور حکمِ نبویؐ کی تعمیل میں اناج بھیج دیا' اس طرح اہل مکہ کو اس تکلیف سے نجات ملی۔ یہ دشمنوں کے مقابلہ میں عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ کا ایک ثبوت تھا۔

حضور نبی کریم ﷺ سہل خو' نرم دل اور رقیق القلب تھے' جفا جو اور سخت خو ہرگز نہ تھے۔ مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہیں بیس روز تک مجلس نبویؐ میں شریک ہونے کا موقع ملا' انہوں نے آپؐ کو رحیم المزاج اور رقیق القلب پایا۔ حضرت جریر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ))(۵) ''جو شخص نرم خوئی سے محروم کیا گیا وہ ہر بھلائی سے محروم کیا گیا''۔

ایک بار ایک صحابی اپنے دورِ جاہلیت کا قصہ بیان کر رہے تھے کہ انہوں نے اپنی لڑکی کو

---

(۵) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الرفق۔

محسنِ اعظم ﷺ عبادات و معاملات میں بھی ایسا طریق اپناتے تھے کہ ان کی اُمت کے لوگ دشواریوں میں گرفتار نہ ہونے پائیں۔ صلوٰۃ التراویح کے متعلق صحیحین اور سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے دو شب یہ نماز لوگوں کے ساتھ پڑھی اور تیسری شب کو آپؐ نماز کے لیے تشریف نہ لے گئے اور پھر صبح لوگوں سے کہا:

((قَدْ رَأَیْتُ الَّذِیْ صَنَعْتُمْ فَلَمْ یَمْنَعْنِیْ مِنَ الْخُرُوْجِ اِلَیْکُمْ اِلَّا اَنِّیْ خَشِیْتُ اَنْ تُفْرَضَ عَلَیْکُمْ)) (۷)

''اس نماز کے لیے تمہارا آنا اور انتظار کرنا وغیرہ میں نے دیکھا' مگر مجھے آنے میں صرف یہ خیال مانع ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ کر دی جائے۔''

ایسی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں کہ آپؐ اپنی اُمت کی سہولت اور آسانی کا خاصا خیال فرماتے تھے۔ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی ﷺ کے شیوۂ عمومی کو ان الفاظ میں روایت فرمایا ہے:

اِنْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لَیَدَعُ الْعَمَلَ وَھُوَ یُحِبُّ اَنْ یَّعْمَلَ بِہٖ خَشْیَۃَ اَنْ یَّعْمَلَ بِہِ النَّاسُ فَیُفْرَضَ عَلَیْھِمْ (۸)

''نبی اکرم ﷺ ایسے عمل کو بھی چھوڑ دیتے جس کا کرنا حضور ﷺ کو پسند ہوتا' اس خیال سے کہ لوگ بھی عمل کرنے لگیں گے اور ڈر ہوتا کہ کہیں وہ عمل فرض نہ ٹھہرایا جائے''۔

اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شفقت و ترحم کا جذبہ حضور نبی اکرم ﷺ میں کتنا مستحکم تھا اور اُمت کی تکلیف آپؐ پر کتنی گراں گزرتی تھی۔

حضور نبی کریم ﷺ جہاں عامۃ الناس کے لیے رحیم اور مؤمنوں کے لیے شفیق تھے وہاں کافروں کے لیے اور حدود اللہ کی پاسبانی کے لیے سخت بھی تھے۔ جب قانونِ شریعت میں اختلال پیدا کرنے کی کوشش ہوتی اور جماعت کی مصلحت کو گزند پہنچانے کی سعی کی جاتی اور کوئی حدود اللہ کو توڑنے کے درپے ہوتا تو آپؐ ہرگز نرمی سے کام نہ لیتے۔ آپؐ ایسے مواقع پر

---

(۷) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب تحریض النبی علی صلاۃ اللیل والنوافل من غیر۔

(۸) صحیح البخاری' کتاب الجمعۃ' باب تحریض النبی علی صلاۃ اللیل والنوافل من غیر۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب استحباب صلاۃ الضحی.....

چٹان کی طرح مضبوط اور ناقابل شکست ہوتے۔ بنی مخزوم میں سے ایک عورت فاطمہ بنت الاسود چوری کے جرم میں پکڑی گئی۔ ثبوتِ جرم کے بعد آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ شرفاءِ قریش کو یہ ناگوار گزرا اور انہوں نے چاہا کہ آپؐ سے سفارش کرا کے اس عورت کو سزا سے بچا لیں' مگر بارگاہِ رسالت میں عرض کرنے کی جرأت کسے تھی! آخر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کو کہہ سن کر اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ آپؐ سے اس کے لیے سفارش کریں۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''اے اُسامہ! تم اللہ کی مقرر کردہ سزا میں سفارش کو دخل دیتے ہو؟'' پھر آپؐ اٹھے اور آپؐ نے خطبہ میں فرمایا کہ ''اے لوگو! تم سے پہلے کی قومیں اسی لیے تباہ ہوگئیں کہ جب ان میں کوئی بڑا خاندانی شخص چوری کرتا تھا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے تھے اور جب کوئی کمزور چوری کرتا تھا تو اسے سزا دیتے تھے۔ خدا گواہ ہے کہ اگر فاطمہ بنت محمد (ﷺ) نے چوری کی ہوتی تو یقیناً میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا''۔(۹)

نبی اکرم ﷺ کا یہ طرزِ عمل کہ کافروں سے سختی روا رکھی جائے' قرآن مجید کے اس ارشاد کی تعمیل میں تھا کہ :﴿یٰٓاَیُّـهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ﴾ (التحریم:۹) ''(اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور اُن پر سختی کرو''۔ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا:﴿اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۪ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ.....﴾(النور:۲) ''زانیہ عورت اور زانی مرد' دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملہ میں تم کو دامن گیر نہ ہو.....'' سورۃ الفتح میں کہا گیا:﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۹) ''محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو اُن کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحم دل ہیں''۔

یہ ہے داعیٔ مکرم' محسن انسانیت اور پیکر صدق و صفا ﷺ کے محامد و مکارم کا ایک خوبصورت ورق جسے ربّ کریم و جلیل نے اپنی رحمت خاص سے تعبیر فرمایا۔ یہی وہ دلآویز اسلوب تھا جس کی بدولت آپؐ ایک عظیم اسلامی انقلاب برپا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آج بھی اسی منہاج اور اسوہ کو ضوفشاں کرنے سے ہم اپنی منزلِ مراد تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکتے

---

(۹) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب حدیث الغار اور متعدد دیگر مقامات۔ وصحیح مسلم' کتاب الحدود' باب قطع السارق الشریف وغیرہ.....

ہیں۔ سیلابِ بلا سے نمٹنے میں یہی ایک نسخۂ کارگر ہے ؎

تباہی صورتِ سیلاب ہے اس سے نمٹنے میں
نہ ہمت بادشاہوں میں نہ جرأت دیں پناہوں میں
نمٹ سکتے ہیں اس سیل بلا سے آج بھی احسن
اگر سرکارؐ کے ہوں نقش پا اپنی نگاہوں میں!

اخذ واستفادہ

(۱) رحمۃ للعالمین ﷺ، از قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ
(۲) سیرت النبی ﷺ، دوم، ششم، از مولانا سید سلیمان ندویؒ
(۳) الرحیق المختوم، از صفی الرحمٰن مبارک پوریؒ
(۴) سیرت رحمت دارین ﷺ، از طالب الہاشمی
(۵) حیاتِ رسولِ اُمی ﷺ، از خالد مسعود
(۶) تفہیم القرآن، اوّل، دوم، از سید مودودیؒ
(۷) نقوش، سیرت نمبر، چہارم، مقالہ ''اوصافِ رسول ﷺ''
(۸) مفردات القرآن، از امام راغب اصفہانیؒ

❁❁❁

نبی اکرم ﷺ بحیثیتِ معلم

پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

☆ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کو معلم بنا کر مبعوث فرمایا۔

☆ آنحضرت ﷺ کے سینۂ اطہر میں لوگوں کو تعلیم دینے کا عظیم جذبہ اور شدید تڑپ تھی۔ آپؐ ہر مناسب وقت اور موزوں جگہ پر تعلیم دیتے اور ہر قسم کے لوگوں کو دولت علم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کی سعی فرماتے۔ آپؐ نے مردوں، عورتوں، جوانوں، بچوں، قرابت داروں، دوستوں، بدوؤں اور نئے مسلمانوں کو تعلیم دی۔ علاوہ ازیں آپ ﷺ تعلیم کے لیے میسر آنے والے ہر موقع سے فائدہ اٹھانے کا خصوصی اہتمام فرماتے۔

☆ آنحضرت ﷺ دورانِ تعلیم شاگردوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خاص خیال رکھتے۔ انہیں اپنے قریب کرتے، کامل خاموشی اور مکمل دھیان سے سننے کا حکم دیتے۔ اپنا چہرہ مبارک ان کی طرف کرتے اور انہیں اپنی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیتے۔

☆ آپ ﷺ اپنے طلبہ کے دلوں میں خوشی پیدا کرنے کے لیے کوشش فرماتے، اپنے اور اُن کے مابین الفت و مودّت کی فضا مہیا کرنے کا اہتمام فرماتے۔ اس غرض کے لیے ان کی حاضری پر انہیں خوش آمدید کہتے، ان کے ناموں اور کنیتوں سے انہیں ندا دیتے، ان کے جسموں پر اپنا دست مبارک رکھتے، اپنے دست شفقت اور قدم پاک سے انہیں (پیار سے) ٹھوکر لگاتے اور ان کے لیے دعا فرماتے۔

☆ آنحضرت ﷺ اس بات کا غایت درجہ اہتمام فرماتے کہ آپ کی گفتگو مکمل طور پر سمجھی جائے، مقصود نکھر جائے اور بتلائی ہوئی معلومات ذہن نشین ہو جائیں۔ اس سلسلے میں آپ ﷺ اپنی گفتگو میں استعمال کردہ الفاظ کو جدا جدا کر کے زبانِ مبارک سے ادا فرماتے۔ بات کو دہراتے، اشارات کا استعمال فرماتے، مسائل کی وضاحت کے لیے شکلیں بناتے، حقائق کو مثالوں کے ساتھ بیان فرماتے، متضاد اشیاء اور باتوں کے باہمی فرق کو اجاگر کرنے کے لیے اسلوب تقابل کا استعمال فرماتے، معلومات کو دلوں میں جاگزیں کرنے کی خاطر گن گن کر ان کا تذکرہ کرتے۔ طلبہ کو زبانِ مبارک سے دی ہوئی تعلیم کا چلتا پھرتا کامل نمونہ اپنی سیرتِ طیبہ کی صورت میں پیش فرماتے۔ اعمالِ شرعیہ کی کمال درجہ زبانی تصویر کشی کے

ساتھ ساتھ انہیں عملی طور پر طلبہ کو کر کے دکھاتے' تا کہ ان کی کیفیت ادائیگی میں معمولی الجھاؤ' اور ادنیٰ تردّد باقی نہ رہ جائے۔

☆ آپ ﷺ شاگردوں کو شریک درس فرماتے۔ اس غرض کے لیے اسلوبِ استفہام کثرت سے استعمال فرماتے۔ علاوہ ازیں دورانِ تعلیم ان سے علمی مسائل کے بارے میں پوچھتے۔

☆ قابل شرم باتوں کا ذکر کنایۃً فرماتے' لیکن شرم کے سبب ضروری باتوں کی تعلیم کو ترک نہ فرماتے۔

☆ آپ ﷺ طلبہ کو سوال کرنے کی اجازت دیتے' اچھے سوال کی تعریف کر کے سائل کی حوصلہ افزائی فرماتے' بوقت ضرورت سوال سے زیادہ جواب دیتے۔ بسا اوقات اپنے جواب کی وضاحت اور سائل کی تسلی کی خاطر تشبیہ اور قیاس استعمال فرماتے' سوال کا جواب معلوم نہ ہونے کی صورت میں خاموش رہتے' البتہ بے کار اور باعث مشقت سوال پر ناراض ہوتے۔

☆ افہام وتفہیم کی غرض سے آپ ﷺ نے اپنے شاگردوں کو مناقشہ ومباحثہ اور سوال وجواب کی اجازت دے رکھی تھی۔ خود بھول جانے کی صورت میں انہیں یاد دہانی کرانے کا حکم دے رکھا تھا۔ مزید برآں اپنی موجودگی میں باصلاحیت شاگردوں کو دوسروں کو سمجھانے کی اجازت دیتے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے شاگرد کی خواہش پر سکھایا ہوا سبق اس سے سنا۔

☆ طلبہ کے ساتھ تواضع' نرمی اور ان کی ضروریات کو اپنی اور اپنے اہل کی ضروریات پر ترجیح دینے میں انتہائے کمال پر پہنچے ہوئے تھے' البتہ کسی شخص کی غیر متوقع غلطی اور سمجھ دار شخص کا عام فہم بات کا ادراک نہ کرنے پر خفا ہوتے۔

☆ آپ ﷺ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں سے خوب آگاہ تھے۔ دورانِ تعلیم ان کے حالات کو پیش نظر رکھتے' اپنے لائق اور باصلاحیت طلبہ کی عزت افزائی فرماتے۔ شاگردوں پر اپنے اقوال وافعال کے اثرات کا دھیان رکھتے اور بوقت ضرورت بیان طلب معاملے کے بارے میں وضاحت فرما دیتے۔ علاوہ ازیں ان میں سے غائب ہونے والوں کے بارے میں پوچھتے' اسبابِ غیاب معلوم ہونے پر بقدر امکان ان کا ازالہ فرماتے۔

☆ آپ ﷺ آسانی اور آسائش مہیا کرنے والے معلم تھے۔ حصولِ علم کے لیے آپؐ نے کوئی لازمی حد اور درجہ مقرر نہ کر رکھا تھا' بلکہ ہر شخص کو اپنی بساط کے مطابق علم حاصل کرنے کی ترغیب دیتے۔ oo

ذکرِ الٰہی سے اعراض کی دُنیوی پاداش

طارق اسماعیل ملک ☆

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِىْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿١٢٤﴾﴾ (طٰہٰ)

''اور جس نے میرے ''ذکر'' سے منہ موڑا تو اس کے لیے دنیا میں زندگی یقیناً تنگ ہوگی اور قیامت کے روز ہم اسے اندھا اٹھائیں گے۔''

درحقیقت جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات بجالاتا ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے منع کیے ہوئے کاموں سے بچتا ہے' پرہیزگاری کی زندگی گزارتا ہے تو اسے اس کا فائدہ دنیا میں بھی حاصل ہوتا ہے کہ اسے اطمینانِ قلب نصیب ہوتا ہے' نیک نامی میسر آتی ہے' اللہ تعالیٰ اس کے دُنیوی اُمور کی بجاآوری میں اس کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کی معاش کشادہ ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث قدسی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَالَ : ..... وَمَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ عَبْدِىْ بِشَىْءٍ اَحَبَّ اِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُهٗ عَلَيْهِ ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِىْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى اُحِبَّهٗ ، فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِىْ يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِىْ يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّتِىْ يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِىْ يَمْشِىْ بِهَا، وَاِنْ سَاَلَنِىْ لَاُعْطِيَنَّهٗ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِىْ لَاُعِيْذَنَّهٗ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَىْءٍ اَنَا فَاعِلُهٗ ، تَرَدُّدِىْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ، وَاَنَا اَكْرَهُ مَسَاءَتَهٗ))(١)

☆ ادارتی معاون شعبہ مطبوعات' قرآن اکیڈمی لاہور

(١) صحيح البخارى' كتاب الرقاق' باب التواضع' ح ٦١٣٧۔

''اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ..... اور میرا بندہ (اپنے آپ کو میری بندگی میں دینے والا) میری کسی پسندیدہ شے کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہے تو میں نے اس پر جو کچھ فرض کیا ہے اس سے بڑھ کر کسی اور ذریعے سے نہیں حاصل کر سکتا۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے قریب تر ہوتا رہتا ہے' یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ پھر جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے' اس کی بصارت بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے تو میں اس کو لازماً عطا کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ طلب کرے تو میں اس کو لازماً پناہ دیتا ہوں۔ اور مجھے کوئی کام کرتے ہوئے ایسا تردّد نہیں ہوتا جیسا تردّد مجھے اس بندۂ مؤمن کے نفس کے بارے میں ہوتا ہے جو موت کو ناپسند کرتا ہے' اور اس کو تکلیف پہنچانا مجھے پسند نہیں''۔

دنیا میں اطمینانِ قلب اور اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہونے کے علاوہ اللہ تعالیٰ اُسے آخرت کی بے بہا نعمتوں سے بھی نوازتا ہے' جن میں سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنا دیدار نصیب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا عالم یہ ہے کہ جب مؤمن کو دیدارِ الٰہی نصیب ہو جائے گا تو اس کے لیے جنت کی دیگر نعمتیں ہیچ ہوں گی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۳۰﴾ نَحۡنُ اَوۡلِیٰٓـؤُکُمۡ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَفِی الۡاٰخِرَۃِ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَشۡتَہِیۡۤ اَنۡفُسُکُمۡ وَلَکُمۡ فِیۡہَا مَا تَدَّعُوۡنَ ﴿۳۱﴾ نُزُلًا مِّنۡ غَفُوۡرٍ رَّحِیۡمٍ ﴿۳۲﴾﴾ (حٰمٓ السجدۃ)

''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے' پھر اس پر وہ ثابت قدم رہے (ان کا یہ دعویٰ محض زبانی کلامی نہیں تھا) یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو' نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت (کی بشارت) سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ ہم اس دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے ساتھی ہیں اور آخرت میں بھی۔ وہاں جو کچھ تم چاہو گے تمہیں ملے گا اور ہر چیز جس کی تم تمنا کرو گے' وہ تمہاری ہوگی۔ یہ ابتدائی مہمان نوازی ہے اُس ہستی کی جانب سے جو بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

یہاں کچھ مفسرین نے نُزُل (ابتدائی مہمان نوازی) سے جنت کی نعمتیں مراد لی ہیں اور

ان کے خیال میں مؤمنین صادقین کی اصل ضیافت دیدارِ الٰہی ہوگا۔

اس کے برعکس جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات سے روگردانی کرتا ہے اور منع کردہ چیزوں میں منہ مارتا ہے تو دنیا میں اسے اس کی سزا یہ ملتی ہے کہ اس کی دنیا اس کے لیے اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود تنگ ہو جاتی ہے' اس سے اطمینانِ قلب چھن جاتا ہے' اور اپنے جرم کی پاداش میں وہ قیامت کے دن اندھا اٹھایا جائے گا' جیسا کہ متذکرہ بالا آیت میں ہے' اور بالآخر جہنم کی سختیاں اور کلفتیں اس کا استقبال کریں گی۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہمیں اپنی امان میں رکھے۔ آمین!

دراصل کسی بھی نیک کام کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ اس سے صرف رضائے الٰہی اور نجاتِ اُخروی کا حصول ممکن ہوتا ہے' حالانکہ اس کے ساتھ ساتھ ہمیں دنیا میں بھی اس نیک کام کے ثمرات نظر آتے ہیں۔ مثلاً نماز ہی کو لے لیجیے۔ اگر تمام لوازمات کا لحاظ رکھتے ہوئے خشوع وخضوع اور اخلاصِ نیت کے ساتھ نماز ادا کی جائے' اس میں کسی ریا کاری یا دیگر منفی مقاصد کا شائبہ نہ ہو تو اس نماز سے انسان کو راحتِ قلب نصیب ہوتی ہے جو کہ ایک عظیم نعمت خداوندی ہے۔ پھر اس کو دنیا میں نیک نامی میسر آتی ہے' لوگ ایسے شخص کا عزت واحترام کرتے ہیں اور اس کے قول وفعل کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ نماز کے پنج وقتہ نظام سے ایسے شخص کی زندگی ایک نظم وضبط کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے اور امورِ زندگی احسن طریقے سے انجام دینا اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی برے کام کے بارے میں ہمارا تصور یہ ہے کہ اس کی سزا محض آخرت میں ہی ملے گی' حالانکہ کسی برے کام کا وبال دنیا میں بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر جھوٹ سے انسان کا دنیا میں اعتبار اُٹھ جاتا ہے اور وہ بہت سی پیچیدگیوں اور مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے ایک جھوٹ کے وبال سے بچنے کے لیے مزید کئی جھوٹ بولنے پڑتے ہیں' اس کے قول وفعل کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اور اسے دُنیوی زندگی میں ہی بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

علامہ ابن القیم الجوزیہؒ نے گناہوں کے درج ذیل متعدد نقصانات کا ذکر کیا ہے:

''(۱) ایسا انسان علم سے محروم رہتا ہے۔ (۲) دل پریشان رہتا ہے۔ (۳) معاملات میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ (۴) بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ (۵) نیک کاموں کی توفیق سے محروم ہو جاتا ہے۔ (۶) برکت ختم ہو جاتی ہے۔ (۷) دل تنگی محسوس کرتا ہے۔ (۸) گناہوں کی کثرت ہو جاتی ہے۔ (۹) گناہوں کی عادت پڑ جاتی ہے۔

(۱۰) گناہگار اللہ تعالیٰ کے ہاں بے وقعت ہو جاتا ہے۔ (۱۱) مخلوقِ خدا کے ہاں بے قدر ہو جاتا ہے۔ (۱۲) جانور اُس پر لعنت کرتے ہیں۔ (۱۳) چہرے پر گناہوں کی نحوست چھا جاتی ہے۔ (۱۴) دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ (۱۵) دعا قبول نہیں ہوتی۔ (۱۶) زمین اور سمندروں میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے۔ (۱۷) غیرتِ انسانی سے محروم ہو جاتا ہے۔ (۱۸) حیا ختم ہو جاتی ہے۔ (۱۹) نعمتوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ (۲۰) مشکلات کی یلغار ہو جاتی ہے۔ (۲۱) دل پر غیر محسوس قسم کا رعب طاری ہو جاتا ہے۔ (۲۲) شیطان کے شکنجے میں رہتا ہے۔ (۲۳) دنیا میں بدترین انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ (۲۴) آخرت میں عذاب سے دوچار ہوتا ہے۔''

مذکورہ بالا آیت کریمہ (طٰہٰ: ۱۲۴) سے' جو اس تحریر کا موضوع ہے' یہ بات بخوبی آشکار ہو رہی ہے کہ ذکرِ الٰہی سے اعراض کرنے کی پاداش میں ایسے شخص کے لیے اُخروی وبال کے ساتھ ساتھ دُنیوی زندگی بھی تنگ پڑ جاتی ہے' زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود اس کے لیے گھیرا تنگ کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے مراد دراصل اس کے تمام احکامات کی بجا آوری اور منہیات سے کنارہ کشی ہے۔ آج اُمت مسلمہ جس بحران سے دوچار ہے یہ اسی ذکرِ الٰہی سے انحراف اور روگردانی کی سزا ہے۔ پانی جو زندگی کی بنیادی ضرورت ہے' ہمارے ہاں اس کا حصول مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ بعض علاقوں میں رہنے والوں کو اس کے لیے کئی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں اور پھر بھی وہ صاف پانی سے محروم رہتے ہیں۔ اشیائے خورد و نوش ملاوٹ سے پاک ہوں' اب اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی ضروریات سے متعلقہ اشیاء کی قیمتیں غریب اور نادار تو کجا متوسط طبقے کی قوت خرید سے بھی بڑھ کر ہیں۔ پاکستان ایک زرعی ملک ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے بے شمار وسائل سے نوازا تھا' مگر آٹے کا بحران شدید ہوتا جا رہا ہے۔ بجلی جو کہ دورِ حاضر میں زندگی کا جزوِ لاینفک ہے' ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے۔ کراچی اور لاہور جیسے شہر اندھیرے میں ڈوبے رہتے ہیں اور گھنٹوں بجلی نہیں آتی۔ کئی علاقے تو ایسے ہیں کہ وہاں دن بھر بجلی نہیں ہوتی۔ بجلی کی بندش کی وجہ سے کاروبارِ زندگی ٹھپ ہو رہے ہیں اور مزید معاشی بحران کا اندیشہ ہے۔ ان حالات میں دنیا کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ مغربی آقاؤں نے کہا تھا کہ اگر پاکستان نے افغان جنگ میں ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم اسے واپس پتھر کے دور میں دھکیل دیں گے' اور آج یہی کچھ ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ اگرچہ یہ سب ہمارے خدا بے زار' عاقبت نااندیش' مفاد پرست اور نفس پرست حکمرانوں کا کیا دھرا ہے' جیسے کہا جاتا ہے: ؎

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!

مگر ہمیں تو اپنے تاریک اعمال اور راہِ راست سے انحراف کی سزا مل رہی ہے‘ جو کہ فاطر فطرت کی سنت ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت تبدیل اور تحویل نہیں ہوا کرتی۔ قرآن کریم فرماتا ہے: ﴿لَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا ۚ﴾ (الفتح) ’’تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کی سنت کو تبدیل ہوتا ہوا‘‘۔ نیز ارشاد باری ہے: ﴿وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا ۚ﴾ (فاطر) ’’اور تم ہرگز نہیں پاؤ گے اللہ کی سنت کو ٹلتا ہوا‘‘۔ ہمارے موجودہ غافل اور مفاد پرست حکمران بھی تو ہمارے ہی چنیدہ ہیں جو ہماری مجرمانہ زندگی کی سزا ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جیسی رعایا ہوتی ہے ویسے ہی اس کے حکمران ہوتے ہیں۔

آج ہر طرف بے حیائی اور فحاشی و عریانی کا دور دورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات سے روگردانی کا عالم تو یہ ہے کہ بے پردگی‘ شراب و کباب‘ جھوٹ‘ فریب ایسی برائیاں ہمارا کلچر بن چکی ہیں اور ہم مغرب کی نقالی میں راہِ راست سے ہٹ چکے ہیں۔ ہمارا نوجوان طبقہ پاپ میوزک‘ گانوں اور فلموں کا رسیا ہو چکا ہے۔ ان چیزوں کی عادات اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ ہمارے نوجوانوں کا ان کے بغیر گزارا نہیں ہے۔

عورت جسے فاطر فطرت نے ایک مقدس مقام دیا ہے اور جس کی جائے قرار اُس کا گھر ٹھہرایا ہے‘ جس کی اصل ذمہ داری خاوند کی اطاعت‘ امورِ خانہ داری اور نئی نسل کی اچھی تعلیم و تربیت ہے‘ وہ آج اپنی ذمہ داریوں کو بھول کر محفل کی زینت بنی ہوئی ہے۔ نیم عریاں‘ بلکہ عریاں لباس کو پسند کرتی ہے اور اپنے جسم کی نمائش کرتی نظر آتی ہے۔ چالاک مرد کے آوارہ نفس نے اپنی آوارگی کی خاطر عورت کو اس کی خوبصورتی کی نمائش کا جھانسہ دے کر اس کا لباس اتروا دیا ہے۔ انتہائی سردی کے دنوں میں بھی مرد کا جسم تو سرتاپا گرم لباس میں ڈھکا ہوا ہوتا ہے‘ مگر بے چاری عورت اس مرد کی خاطر ادھورے لباس میں ہے اور اسی پر خوش ہے۔ کچھ عرصہ قبل بعض ایئر ہوسٹسز نے درخواست کی تھی کہ انہیں سردیوں کے ایام میں پورا لباس پہننے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ سردی سے بچ سکیں‘ مگر مردوں کی دل لگی کو ترجیح دیتے ہوئے ان کی درخواست رد کر دی گئی۔

آج کا مسلمان نوجوان جس کے ہاتھ میں اُمت کی تقدیر ہے‘ جسے منہیاتِ الٰہی سے بچتے ہوئے اور احکاماتِ الٰہی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اُمت کو بامِ عروج تک پہنچانا تھا‘ وہ آج خود

اُمت کی تاریخ سے بے بہرہ اور پستی میں گرا ہوا ہے' شیطانی چالوں کا شکار ہو کر بے عملی کی زندگی گزار رہا ہے۔ اُمت کا شاہین بچہ جس کے ہاتھ میں قرآن وحدیث اور قلم ہونا چاہیے تھا' آج اس کے ہاتھ میں فحش میگزین' ویڈیو گیمز اور بے حیا فلموں کی سی ڈیز ہوتی ہیں۔ پختہ عمر افراد جن کا کام نئی نسل کو راہِ راست پر لانا اور چلانا تھا' وہ آج لچر اور فحش محافل کا اہتمام کرتے نظر آ رہے ہیں اور اپنی اصل ذمہ داریوں سے بالکلیہ غافل ہیں۔

ہماری سیاست خدا بے زار اور جھوٹ پر مبنی ہے' غیر اللہ کی حکمرانی ہے۔ ہماری معیشت کی بنیاد سود اور جوئے پر ہے۔ سود کی شناعت کا عالم تو یہ ہے کہ ایک حدیث نبویؐ کے مطابق یہ اپنی ماں کے ساتھ نکاح کرنے جیسے گھناؤنے فعل کے مترادف ہے۔ ہماری معاشرت تباہ ہو رہی ہے۔ اسلامی اور مشرقی اقدار کا جنازہ نکالا جا رہا ہے۔ یہ سب اسی ذکر الٰہی اور احکاماتِ الٰہی سے اعراض کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ﴿٣٦﴾﴾

(الزخرف)

''اور جو شخص رحمٰن کے ذکر سے تغافل برتتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں' پس وہ اس کا رفیق بن جاتا ہے۔''

طرفہ تماشا تو یہ ہے کہ ہمیں احساس ہی نہیں ہے کہ ہم نے راہِ راست سے ہٹ کر غلط رُخ اختیار کر لیا ہے۔ ہم نے اپنی منزل کا تعین ہی غلط کیا ہے اور اسی رخ پر بگٹٹ چلے جا رہے ہیں۔ جیسے اقبال نے کہا تھا: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

آج اس اُمت کے دل سے احساسِ زیاں بھی رخصت ہو رہا ہے اور یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ احساس ہی نہ ہو کہ وہ غلط رخ پر جا رہا ہے تو وہ پلٹے گا کیسے! اس کی پلٹنے اور راہِ راست پر آنے کی امید معدوم ہو جاتی ہے۔ وہ جتنا آگے جائے گا اپنی حقیقی منزل سے دور ہوتا جائے گا اور بالآخر کانٹوں بھری کھائی میں گر جائے گا۔ آج ہم نے اس مجرمانہ زندگی اور غفلت کو بزعم خویش ''صراطِ مستقیم'' سمجھ لیا ہے اور بہت تیزی سے اس پر چل رہے ہیں۔

آج جو خدا ترس اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلاتا ہے' صراطِ مستقیم اور اصل منزل کی طرف متوجہ کرتا ہے اسے دقیانوسیت کی ''گالی'' دی جاتی ہے کہ یہ ہمیں بے فائدہ کاموں کی

طرف بلاتا ہے۔ ایسا شخص اس ماحول میں اجنبی اور غریب شہر سا بن کر رہ جاتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حدیث مبارکہ ہے:

((بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا))(۲)

''اسلام کی جب ابتدا ہوئی تھی تو اسلام اجنبی تھا' اور پھر ویسے ہی اجنبی ہو جائے گا جیسے ابتدا میں تھا''۔

جاہلیت کا دور دورہ تھا' آفاقی تعلیمات کو لوگ نہیں جانتے تھے۔ چوری' ڈاکہ زنی' شراب نوشی اور بدکاری کا رواج تھا۔ ایسے میں جب رسول اللہ ﷺ نے توحید اور اسلام کی دعوت دی تو لوگ حیران ہو گئے کہ یہ کون آ گیا ہے جو صرف ایک خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہے؟ ہمارے تو بے شمار خدا اور دیوی دیوتا ہیں اور اس کا خدا صرف ایک ہے! یہ کون ہے جو شراب سے منع کرتا ہے؟ شراب تو ہمارے رگ و پے میں رچی بسی ہے! یہ کون ہے جو آزاد جنسی تعلقات کو حرام کہتا ہے؟ اس کے بغیر تو ہمارا گزارا نہیں ہے! یہ کیسا شخص ہے جو چوری ڈاکے سے منع کرتا ہے؟ یہی تو ہماری معاش کا اصل ذریعہ ہے۔ ڈاکہ زنی ہی تو ہماری صلاحیتوں' طاقت اور دانش مندی کے مقابلے کا میدان ہے۔

چنانچہ ابتدا میں جب اسلام کی دعوت دی گئی تو وہ اجنبی تھا۔ یہ دعوت لوگوں کو غیر مانوس سی معلوم ہوئی تھی۔ اور رسول اللہ ﷺ فرما رہے ہیں کہ بالآخر اسلام دوبارہ اجنبی ہو جائے گا۔ اسلام کی تعلیمات پس پردہ چلی جائیں گی۔ طاغوت اور شیطنت غالب ہو گی اور ایسے میں اسلام کی دعوت اور اس کا داعی اجنبی سے معلوم ہوں گے۔ آج بعینہٖ یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف بلانے والے' منکرات سے روکنے والے اور احکاماتِ الٰہی کی بجاآوری کی دعوت دینے والے کو دقیانوسی اور بنیاد پرست کہا جاتا ہے کہ ع ''اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!'' کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ کہاں سے آ گئے ہیں جو سود کو حرام کہتے ہیں' جبکہ سود کے بغیر معاشی نظام کو چلانا اور دوسری اقوام کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ یہ کون لوگ ہیں جو ہماری عورتوں کو نقاب اوڑھانا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عورت کا اصل ٹھکانہ گھر ہے اور مخلوط محافل اس کے لیے ناجائز ہیں' جبکہ نقاب میں تو عورت بہت بدنما بلکہ چور لگتی ہے' اور جب تک عورت مرد کے کندھے سے کندھا ملا کر کاروبارِ دُنیوی میں برابر شریک نہ ہو ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ چلنا ناممکن ہے۔ یہ لوگ شراب و شباب سے دل لگی سے منع کرتے ہیں' جبکہ یہ تو کلچر

(۲) صحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان ان الاسلام بدأ غريبا و سيعود غريبا و انه يأرز۔

ہے‘ شراب وشباب کے بغیر تو محفل کا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ آج دھوکہ‘ فریب اور جھوٹ کی بنیاد پر کاروبار کرنے والے کو بہت عقل مند اور چالاک کہا جاتا ہے کہ یہ شخص وقت کے تقاضے کو صحیح طور پر سمجھتا ہے اور Worldly wise ہے۔ جو خدا ترس انسان جھوٹ وفریب سے نفور ہو اسے بے وقوف اور ناسمجھ کہا جاتا ہے کہ اس کو تو کاروبار کرنے کا سلیقہ ہی نہیں ہے۔ داعیانِ حق کو ستایا جاتا ہے اور ہمارا اپنا حکمران طبقہ ہی ان کو اپنے ظلم وتعدی کا تختۂ مشق بنائے ہوئے ہے۔ حالانکہ یہ لوگ اسلام کی بات کرتے ہیں اور اسلام ہی کے نام پر یہ ملک وجود میں آیا تھا۔ بانیانِ اسلام نے یہی کہا تھا نا کہ: ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

یہ لوگ توحید کا نغمہ ہی تو گا رہے ہیں جنہیں ہمارے عوام بے وقوف‘ مستقبل کی فکر سے بے گانہ اور رجعت پسند کہتے ہیں اور حکمران ان کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ لیکن ایسے لوگوں کے لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ)) ’’پس ایسے اجنبی (بن کر رہنے والوں) کے لیے خوشخبری ہے (کہ انہیں دنیا میں بھی بالآخر سرخروئی اور غلبہ نصیب ہوگا اور جنت میں ان کے لیے اللہ نے نعمتیں تیار کر رکھی ہیں)‘‘۔ یہ لوگ خوش نصیب ہیں جو رجعت پسند کہلوانا اور اجنبی (غریب شہر) بن کر رہنا تو پسند کر لیتے ہیں مگر اپنے پاکیزہ مقاصد سے فرار اختیار نہیں کرتے۔ اور یہ ایسا کریں بھی کیوں‘ جبکہ مقابل خم ٹھونک کر میدان میں آ چکے ہیں: ؎

اِک طرزِ تغافل ہے سو وہ تم کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے وہ ہم کرتے رہیں گے!

ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران) ’’اور تم ہی اعلیٰ (اور غالب) ہو گے اگر تم سچے مؤمن ہو‘‘۔ ایک جگہ فرمایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ جٰهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ (العنکبوت:٦٩) ’’اور جن لوگوں نے ہماری راہ میں جدوجہد کی ہم لازماً ان کے لیے اپنے راستے آسان کر دیں گے‘‘۔

ہمارے سیکولر ذہن رکھنے والے‘ مفاد پرست دانشور اور کچھ ناسمجھ‘ غیروں کی عیاری کا شکار دانشور یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری ترقی کی راہ میں (نعوذ باللہ) اسلام رکاوٹ ہے کہ ہم ہر کام میں اسلام کو ’’گھسیڑ‘‘ دیتے ہیں۔ نقل کفر کفر نباشد۔ یہ سیکولرزم (لادینیت) کا فلسفہ ہے کہ دنیا اور دین ومذہب الگ الگ چیزیں ہیں‘ ان کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے‘ دین ومذہب

ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے ☆۔ یہ فلسفہ اب غیر شعوری طور پر ہمارے سادہ لوح لوگوں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ ایک باریش اور پابند شریعت بزرگ نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے کہ ایک بار وہ جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا کلین شیو آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس آدمی نے اس بزرگ سے نام پوچھا اور پھر کہنے لگا کہ دیکھو میں شراب بھی پیتا ہوں اور بے حیائی کے دیگر کام بھی کرتا ہوں' اس کے باوجود میں مسلمان ہوں اور میرا نام عبدالرحمٰن ہے۔ اس شخص کے کہنے کا مطلب تھا کہ ان کاموں سے ہمارے اسلام میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' تم خواہ مخواہ شریعت کی پابندی کرتے ہو اور نفس کے ان پسندیدہ کاموں سے باز رہتے ہو۔

دراصل ہمارے یہ دانشور مغرب کی ظاہری چمک دمک اور مادی ترقی سے مرعوب ہیں۔ ان کا خیال ہے' اور اس کا یہ پرچار کر رہے ہیں' کہ مغرب کی بزعم خود ترقی کا راز اسی میں ہے کہ انہوں نے شریعت موسوی کو ساقط کر دیا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے آزاد ہیں۔ ان کا مذہبی معاملہ ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اس کی بدولت اب وہ خوشحال ہیں اور اپنی معاشی پریشانیوں سے سبکدوش ہو چکنے کے بعد فضاؤں اور ہواؤں کو مسخر کر رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مغرب تو ''دورِ ظلمات'' (Dark Ages) میں تھا' مسلمانوں ہی سے انہوں نے سائنس اور دیگر علوم سیکھے جن سے ان کے اندھیرے چھٹ گئے۔ (اگرچہ ان کے باطن میں ابھی تک گھپ اندھیرا ہے' جو صرف وحی کی روشنی سے چھٹ سکتا تھا' جس کا انہوں نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اس کے مقابلے میں آنے کی ہمت بھی کر لی ہے)۔ مغرب کی اس مادی ترقی اور خوشحالی کی اور بھی بہت سی وجوہات ہیں' جو اس تحریر کا موضوع نہیں ہے۔

اس دور کو بجا طور پر ''فتنوں کا دور'' کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے کچھ نام نہاد نوآموز دانشور حضرات جو اپنی پہچان بطور مسلمان سکالر کراتے ہیں' وہ نت نئے فتنوں کو جنم دے رہے ہیں۔ موسیقی کو جائز کہہ رہے ہیں' چہرے کے پردے کے قائل نہیں ہیں' ناچنے کی بھی ان کے ''اسلام'' میں گنجائش ہے' سود کی کچھ شکلیں جائز قرار دے رہے ہیں' وغیرہ۔ یہ چیزیں تو ایسی ہیں جن سے فطرت بھی اباء کرتی ہے۔ عام شخص غیر شعوری طور پر بھی ان کو ناجائز سمجھتا ہے۔ ان فتنوں کا خاص طور پر شکار تو مغرب کا ترتیب دیا ہوا نصابِ تعلیم پڑھنے والے' آزاد خیال اور عقلیت پرست لوگ ہی ہو رہے ہیں' مگر آہستہ آہستہ یہ عام لوگوں تک بھی رسائی حاصل

☆ چھوٹی سکرین پر ایک پاکستانی ڈرامے میں بھی یہ جملہ سننے کو ملا: ''خیر مذہب تو ہر شخص کا انفرادی معاملہ ہے!''

کررہے ہیں۔ دراصل انسان جب اپنی بداعمالی کو طول دینے پر آمادہ ہو تو پھر اس کا جواز پیدا کرنے کے لیے نئے نئے بہانے تلاش کرتا ہے۔ ہمارے ایک دانشور نے (معاذ اللہ) شراب کی ''تھوڑی مقدار'' کو جائز کہہ دیا ہے۔ یہ لوگ ان چیزوں کے لیے بہت پیچیدہ قسم کے دلائل پیش کرتے ہیں کہ عام آدمی متاثر اور لاجواب ہو جاتا ہے۔ ؎

وہ انا پرست ہے اتنا کہ میری ہر بات سے پہلے
بند وہ میری ہر کتاب کر دے گا
میں سچ کہوں گا اور ہار جاؤں گا
وہ جھوٹ کہے گا اور لاجواب کر دے گا

درحقیقت کوتاہ بین سکالرز کی نگاہوں کے سامنے محض اس دنیا کا ظاہری' خوبصورت اور دبیز پردہ ہے اور ان کی نگاہ اسی پردے کی دلکشی میں کھب کر رہ گئی ہے۔ اس پردے کے پیچھے جو حقیقت ہے اور جو اصل فلم چل رہی ہے ان کی نگاہِ نارسا کی وہاں تک رسائی نہیں ہے۔ لیکن ہمارے حقیقی معنوں میں دانشوروں' دنیا بے زار' خداترس اور حقیقت بین نگاہ رکھنے والے سعادت مندوں کی نگاہ حقیقت کو دیکھ رہی ہے اور اُن کا اس بات پر یقین کامل ہے کہ ہماری موجودہ زبوں حالی اور ہوشربا تنگ دامانی کا اصل سبب اللہ تعالیٰ کے ذکر یعنی احکاماتِ الٰہی سے اعراض ہے۔ اور ہماری عظمتِ رفتہ کی بازیابی بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ذکرِ الٰہی سے سرشار ہوں' اللہ تعالیٰ کے احکامات کو بجالائیں اور منکرات سے پرہیز کریں۔ تب ہمارے لیے زمین بھی اپنے خزانے اگل دے گی اور آسمان سے بھی اللہ کی رحمتیں نازل ہوں گی۔ ہمارے مغرب زدہ دانشوروں کے مقابلے میں یہ لوگ اپنی امکانی حد تک کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ سادہ لوح لوگوں کو بھٹکنے سے کسی حد تک بچا رہے ہیں۔ اگرچہ شر پسند عناصر طاقتور ہیں' ان کو مغرب کی تائید حاصل ہے' الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا ان کے قبضے میں ہے' لیکن: ؎

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا — مایوس تو نہیں ہیں طلوعِ سحر سے ہم
لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے — کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم
مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے — کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم!

❁❁❁

اسلامی تحریکوں کے ذمہ داران کے مطلوبہ اوصاف

مولانا صدرالدین اصلاحی

ہر تنظیم بنیادی طور پر دو قسم کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔ تنظیمی لحاظ سے دونوں کی حیثیتیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں اور ان کی ذمہ داریاں بھی جدا جدا ہوتی ہیں۔ کچھ لوگ تو وہ ہوتے ہیں جو اُس تنظیم میں اعضائے رئیسہ کا سا مقام رکھتے ہیں، اور باقی تمام لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی حیثیت عام اجزائے جسم کی سی ہوتی ہے۔ دنیا کا کوئی اجتماعی ادارہ نہ تو صرف اعضائے رئیسہ کی بدولت برقرار رہ سکتا ہے، نہ صرف عام اعضاء و جوارح کے بل پر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کی زندگی، اس کی توانائی اور اس کی ترقی کے لیے چند چیزیں انتہائی حد تک ناگزیر ہوتی ہیں، جن میں سب سے اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ہی قسم کے لوگ اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک طور سے ادا کرتے رہیں، انہیں اپنی اپنی حدود بھی معلوم ہوں اور اپنے فرائض کا بھی پورا پورا احساس ہو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی اس علم اور اس احساس میں کوتاہ رہا تو یہ اجتماعی ادارہ ڈیڑھ پہیے کی گاڑی بن کر رہ جائے گا۔ اور اگر کوتاہی و خام کاری کے مرض میں دونوں ہی مبتلا رہے تو پھر گاڑی ٹوٹے ہوئے پہیوں پر بری طرح ہچکولے کھاتی ہوئی بس جوں توں گھسٹتی رہے گی، اور نہیں کہا جا سکتا کہ کب کس کھڈ میں جا گرے گی۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو بالعموم ہر کام اجتماعی شکل میں اور نظم کے ساتھ انجام دینے کی جو ہدایتیں دی ہیں ان کا بیّن تقاضا ہے کہ اس دین کی حمایت اور نصرت و اقامت کے لیے قائم کی جانے والی تحریکیں بھی ان کے تقاضوں کو اچھی طرح محفوظ رکھیں، اور منظّم طور سے اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھائیں۔ اسلامی تحریکوں یا تنظیموں کے ''اعضائے رئیسہ'' جماعتی ذمہ دار اور امراء کہلاتے ہیں، اور عام اعضاء و جوارح ان کے ماتحت یا ''مأمورین'' ہوتے ہیں۔ خدا

اور اس کے رسول ﷺ نے ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کی ذمہ داریوں کو بڑی وضاحت سے بیان فرما رکھا ہے' اور ان اخلاقیات پر بھی پوری طرح روشنی ڈال دی ہے جن کی اس خصوص میں نمایاں اہمیت ہے۔ میں اِس وقت موقع اور ضرورت کی مناسبت سے صرف انہی ذمہ داریوں اور انہی اخلاقی صفات کی یاددہانی کرانا چاہتا ہوں جو اسلامی تحریکوں کے اصحابِ امر سے' خواہ وہ کسی درجے اور حیثیت کے ہوں' تعلق رکھتی ہیں۔

ایک جامع الفرائض دعا

قرآن کریم کی ایک دعائیہ آیت کا آخری ٹکڑا ہے:

﴿..... وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾﴾ (الفرقان)

''.....اور (اے پروردگار!) ہمیں متقیوں کا سربراہ بنا۔''

اس دعا کا سادہ انداز میں مفہوم یہ ہے کہ خدایا! جو لوگ ہماری ماتحتی اور نگرانی میں ہیں انہیں تقویٰ کی راہ پر چلا۔

تین لفظوں کا یہ دعائیہ جملہ جوامع الکلم میں سے ہے' اور ایک فرض شناس مسلمان کی نگہ جستجو کے لیے اس میں سب کچھ موجود ہے۔ کیونکہ یہ اگرچہ بظاہر صرف ایک دعا ہے' مگر اس دعا کے پس منظر میں ان سبھی واجبات اور صفات کے مطالبے موجود ہیں جن سے ہم اہلِ ایمان کی تصویر مکمل ہوتی ہے۔ جب ایک مردِ مؤمن اپنے ربّ سے یہ التجا کر رہا ہوتا ہے کہ وہ اسے اہل تقویٰ کا سربراہ بنا دے' تو یہ التجا دعا ہونے کے ساتھ ساتھ لازماً اس عہد پر بھی مشتمل ہوتی ہے کہ اپنی استطاعت کی حد تک میں خود بھی اس مدعا و مطلوب کے حصول کے لیے کوشاں رہوں گا۔ کیونکہ دعا صحیح معنوں میں دعا ہوتی ہی اُس وقت ہے جب اس کا رشتہ دعا کرنے والے کی اپنی ممکنہ کوششوں سے جڑا ہوا ہو۔ آدمی اپنے مطلوب کے لیے خود تو کچھ نہ کرے' اور صرف یاربِّ یاربِّ پکارتا رہے تو یہ دعا نہیں' تمنی علی اللہ ہوگی' جو نہ عقلاً کوئی پسندیدہ چیز ہے نہ شرعاً۔

اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اہل ایمان کو ''اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا'' کی دعا کے ساتھ ساتھ کیا کوششیں انجام دینا اور دیتے رہنا چاہیے کہ ان کی یہ عظیم المقاصد دعا صحیح معنوں میں دعا بن جائے' تمنی علی اللہ بن کر نہ رہ جائے؟ جواب اس سوال کا یہ ہے کہ دعا کرنے والا اپنے جن زیر اثر اور ماتحت لوگوں کو متقی دیکھنا چاہتا ہے' انہیں تقویٰ کی صفات سے آراستہ کر دینے یا آراستہ بنائے رکھنے کی جس طرح وہ خدا سے التجا کرتا ہے' اسی طرح اس مقصد کی خاطر خود بھی

سعی وتدبیر کرتا رہے' اور اپنے ماتحتوں کو تقویٰ کے مقام تک پہنچا دینے میں اپنی سی کوئی کوشش اٹھا نہ رکھے۔ لیکن ذرا ٹھہریے' یہ جواب ابھی تشنہ ہے' اور یہ مکمل اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاملہ کا ایک اور اہم پہلو بھی سامنے آ جائے' اور وہ یہ کہ ''اِجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا'' کی دعا میں اگرچہ ذکر تو صرف ماتحتوں کے صاحبِ تقویٰ ہونے یا بنائے جانے کی التجا کا ہے' مگر لفظوں میں مذکور نہ ہونے کے باوجود اس التجا سے پہلے ایک اور اہم تر التجا بھی اس دعا میں موجود ہے' اور وہ یہ ہے کہ خدایا! خود ہمیں بھی نہ صرف متقی بلکہ ان سب سے بڑھ کر متقی بنا دے۔ کیونکہ یہ بالکل بے معنی سی بات اور بڑی بے جا قسم کی جسارت ہوگی کہ آدمی خود تو تقویٰ کے معاملہ میں کچھ یوں ہی سا ہو' مگر اللہ تعالیٰ سے عرض پر عرض کرتا رہے کہ وہ اسے متقیوں کا امام بنا دے۔ ایسی عرض ومعروض تو اسی شخص کو زیب دے سکتی ہے جو خود بھی صاحب تقویٰ ہو اور تقویٰ کی صفت سے اپنے کو بیش از بیش بہرہ ور کرتے رہنے کی بصدقِ دل التجا کرتا رہے' بلکہ اَتْقٰی یعنی دوسروں سے بڑھ کر متقی ہو' یا اَتْقٰی بن جانے کی فکر اور کوشش میں ہو۔ مذکورہ بالا سوال کا یہ مکمل جواب سامنے آ جانے کے بعد واضح طور پر اہل ایمان کی ذمہ داریاں دوگونہ قرار پا جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ تقویٰ اور خدا پرستی کی راہ میں اپنے کو زیادہ سے زیادہ آگے بڑھاتے رہیں' دوسری یہ کہ اپنے ماتحت افراد کو بھی اس مدارِ دین ایمانی صفت سے بہرہ ور کرتے رہنے کے لیے برابر فکرمند اور کوشاں رہیں' اور پھر دونوں ہی باتوں کے لیے خدا سے سچی دعائیں بھی کرتے رہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی نظر میں رہنی چاہیے کہ تقویٰ کی صفت بجائے خود تو مطلوب دین ہے ہی' ساتھ ہی اس لیے بھی مطلوب اور ضروری ہے کہ جب تک پیروانِ اسلام کے اندر یہ ایمانی جوہر ایک معقول حد تک موجود نہ ہو اُس وقت تک اسلام اپنے پورے وجود کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ جو نظامِ رحمت لے کر آیا ہے وہ خدا کی زمین پر ہرگز قائم نہیں ہوسکتا' اور اگر پہلے سے قائم ہو تو اپنی جگہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اس لیے کوئی بھی اسلامی تحریک اپنے سفر کے اس اصل زادِ راہ سے تہی دامن رہ کر' یا اس کی محض معمولی سی مقدار کے بل پر کبھی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔

ان تمہیدی' مگر بنیادی نکتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آیئے ان اہم صفات کو ذہن نشین کرلیں جو کسی اسلامی تحریک کے ذمہ داروں میں خصوصی اہمیت کے ساتھ لازماً پائی جانی چاہئیں' اور جن کی موجودگی پر ہی اس تحریک کی کامیاب پیش قدمی بہت بڑی حد تک موقوف رہتی ہے۔

(۱) احتسابِ نفس

سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت تو احتسابِ نفس کی صفت ہے۔ جب تک اس احتساب پر بھرپور توجہ نہ رہے گی اُس وقت تک یہ ذمہ داران تحریک ان صلاحیتوں اور صالحیتوں کے مالک بن ہی نہیں سکتے جو تحریک میں اقدام کی روح دوڑا سکتی اور اسے ترقی کی راہ پر رواں دواں رکھ سکتی ہیں۔ پس مبالغہ نہ ہوگا اگر احتسابِ نفس کو تحریک کی کامیابی کی شاہ کلید سمجھا جائے۔

یہ احتساب کیوں ضروری ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا نظری جواب اگرچہ ہم سب جانتے ہیں، مگر موضوعِ گفتگو کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس جانے ہوئے جواب کو پھر سے جان لیا جائے، تاکہ وہ ذہنوں میں تازہ ہو رہے۔ کیونکہ یہ جواب جس قدر معلوم اور واضح ہے اسی قدر اس کے تقاضوں کو پورا کرنا دشوار، اور اس کا عملی نتیجہ کم یاب ہے۔ کون نہیں جانتا کہ نفس کی کیادی (مکروفریب) بے مثال اور اس کے حملوں کی شدت بے نظیر ہوتی ہے۔ یہ حملے اتنے شاطرانہ انداز کے، اور اس طرح چھپ چھپ کر ہوا کرتے ہیں کہ بس حضرات انبیاء علیہم السلام ہی اس سے پوری طرح محفوظ رہ سکے ہیں۔ آدمی کو محسوس تک نہیں ہو پاتا اور وہ متاعِ دین و ایمان لوٹ لے جاتا ہے۔ یہ نفس جس شیطانِ اعظم کا ایجنٹ ہے وہ عین دربارِ خداوندی میں چیلنج دے آیا ہے کہ میں ابنِ آدم کو اپنی گرفت میں لے لینے کی کوئی تدبیر اور کوشش اٹھا نہ رکھوں گا، اور اس پر سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، غرض ہر جہت اور ہر رُخ سے چھاپے ماروں گا۔ پوری انسانی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے جو عہد کیا تھا اسے پورا کر دکھانے میں کم از کم اسّی نوے فی صد تو بہرحال کامیاب رہا۔ کوئی چالاک دشمن جب بھی اپنے حریف پر دھاوا مارتا ہے تو اس کی طاقت کا اندازہ لگا کر مارتا ہے۔ شیطان اور اس کا ایجنٹ نفسِ امارہ اس اصولِ جنگ کے ماہر ہیں۔ جو افرادِ انسانی جتنے ہی زیادہ قوی الایمان اور صاحبِ علم و عرفان ہوتے ہیں انہیں پھانس لینے کے لیے وہ اتنا ہی زیادہ مضبوط آہنی جال بچھاتے رہتے ہیں، اور اگر وہ قوی الایمان اور صاحب علم و عرفان ہونے کے ساتھ ساتھ نصرتِ دین کے مردِ میدان بھی ہوں تو وہ اپنے اس آہنی جال کی کڑیوں کو اور زیادہ کس دیتے ہیں۔ صحیح معنوں کی اسلامی تحریکوں سے بڑھ کر اس موذی کا مبغوض اور کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بڑے سے بڑے عابدوں اور زاہدوں کو تو شاید کچھ دیر کے لیے برداشت کر لے، مگر دین حق کا علَم اٹھانے والوں کو ایک آن بھی برداشت نہیں کر

سکتا۔ وہ اس جنگی تدبیر سے بھی بخوبی آگاہ ہے کہ غنیم کے لشکر کو تہہ و بالا کر کے رکھ دینے کی سب سے کارگر شکل یہ ہے کہ اس لشکر کے سالاروں اور کمانڈروں کا کام تمام کر دیا جائے' پھر باقی فوج آپ سے آپ سفید جھنڈے لہرانے لگے گی۔ یہ خوفناک حقیقت متنبہ کرتی ہے کہ اسلامی تحریکوں کے عام ارکان بالعموم اور ان کے ذمہ دار بالخصوص' نفس اور شیطان کی طرف سے برابر چوکنے رہیں۔ ایک طرف تو انہیں ان کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے' دوسری طرف اپنے اندرون میں جھانک کر دیکھتے رہنا چاہیے کہ کہیں شیطان نقب تو نہیں لگا رہا ہے۔ ان دو گونہ فکرمندیوں اور کوششوں کے بعد ہی اس توقع کا رکھنا حق بجانب ہوسکتا ہے کہ اس کے مذموم عزائم کامیاب نہ ہونے پائیں گے۔

احتسابِ نفس کے پہلو ایک دو نہیں' بہت سے ہیں۔ ان کی اہمیتوں کے درجات اور وقت کی گنجائش کو دیکھتے ہوئے میں یہاں صرف دو اہم ترین پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانے پر اکتفا کروں گا۔

(i) اخلاصِ نیت: پہلی چیز جسے اس احتساب کے سلسلے میں خصوصیت سے ملحوظ رکھنا چاہیے' نیت کا اخلاص ہے۔ اہل ایمان کی نیتوں کا خلوص شیطان کے لیے حد درجہ سوہانِ روح ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی شعلہ بار نگاہیں اسے برابر گھورتی رہتی ہیں۔ اس کے لیے یہ لڑائی کا ایسا محاذ ہوتا ہے جسے وہ سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اگر اسے توڑ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو دوسرے سارے مورچے آپ سے آپ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں۔ گویا اکیلے اِس محاذ کا ختم ہو جانا پوری لڑائی کے ہار جانے کے ہم معنی ہوتا ہے' کیونکہ اس کے بعد نہ نماز' نماز رہ جاتی ہے' نہ زکوٰۃ' زکوٰۃ رہ جاتی ہے۔ دعوت الی اللہ' نصرتِ اسلام اور اقامتِ دین کے صرف دعوے اور الفاظ رہ جاتے ہیں' ان کے اندر سے معنویت اسی طرح غائب ہو جاتی ہے جس طرح دل کی حرکت بند ہو جانے سے جسم سے زندگی ناپید ہو رہتی ہے۔ اس خوفناک بلا کے خطروں سے مأمون تو کوئی بھی نہیں ہوتا' مگر جو شخص جتنی ہی زیادہ نمایاں دینی پوزیشن رکھتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ ان خطروں کی زد میں رہتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحابِ امر' خواہ وہ کسی درجے کے ہوں' اپنے اپنے دائروں میں بہرحال ایک خاص پوزیشن کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ پوزیشن بجائے خود بھی کمزور آدمی کے لیے فتنہ کا سامان بن سکتی ہے' نفس آسانی سے اسے یہ وہم دلا سکتا ہے کہ امارت کا یہ منصب اس کے لیے ایک اعزاز اور وجہِ افتخار ہے' حالانکہ فی الاصل وہ ایک بھاری ذمہ داری کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اس منصب کے ساتھ ساتھ

اللہ تعالیٰ کی عنایت نے اسے کسی مخصوص اور نمایاں قسم کی صلاحیت سے بھی نواز رکھا ہو‘ مثلاً تحریر و تصنیف کی صلاحیت‘ یا تقریر و خطابت کی صلاحیت‘ یا مؤثر افہام و تفہیم کی صلاحیت‘ یا حسنِ کارکردگی کی صلاحیت‘ تو پھر خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے اور غافل شخص بڑی آسانی سے تعلّی کا شکار اور شہرت کا حریص بن جاتا ہے۔ اپنی کسی اچھی صلاحیت پر لوگوں کی تحسین سے خوشی محسوس کرنا تو کوئی معیوب بات نہیں‘ مگر جب یہ خوشی آگے بڑھ کر اپنی شخصیت کی بلند قامتی کے احساسِ فخر میں تبدیل ہو جائے تو پھر بڑی تباہ کن بیماری بن جاتی ہے۔ اس طرح کا احساس نہ صرف یہ کہ بجائے خود ایک انتہائی ناپسندیدہ چیز ہے‘ بلکہ وہ تحریر و تقریر کے مٹھ کو بھی مار دیتا ہے اور بات کا اثر بس اپنی ایک لپک سی دکھا کر ختم ہو رہتا ہے اور یہ اس تحریک کے حق میں ایک بڑی خیانت اور ایک بڑا ظلم ہے جس نے اسے امارت کی کوئی چھوٹی یا بڑی ذمہ داری سپرد کی ہوتی ہے۔

(ii) **شرائع کی پابندی میں عزیمت کا رویہ**: احتسابِ نفس کے ضمن میں تحریکی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز یہ ہے کہ ذمہ دارانِ تحریک کو شرائع کی پابندی میں‘ بالخصوص ان کی دونوں عملی بنیادوں‘ نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں‘ نسبتاً زیادہ عزیمت کا رویہ اختیار کیے رہنا چاہیے اور معمولی معمولی عذرات کی آڑ ہرگز نہ لینی چاہیے۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک بار ایک نابینا صحابیؓ نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ’’میں ایک اندھا آدمی ہوں اور مدینہ کی بستی میں سانپ‘ بچھو اور درندے کثرت سے نکلا کرتے ہیں‘ کوئی ایسا شخص بھی میسر نہیں جو مجھے مسجد تک پہنچا دیا کرے‘ اس لیے حضورؐ اجازت دے دیں کہ میں نماز گھر ہی میں پڑھ لیا کروں‘‘۔ آپؐ نے اجازت مرحمت فرما دی۔ اجازت حاصل کر کے جب وہ صاحب لوٹ کر جانے لگے تو انہیں واپس بلا کر آپؐ نے پوچھا: ((هَلْ تَسْمَعُ النِّدَاءَ بِالصَّلٰوةِ؟)) ’’کیا تمہیں نماز کی اذان سنائی دیا کرتی ہے؟‘‘ انہوں نے جواب دیا: ’’نَعَمْ‘‘ (ہاں حضورؐ! سنائی تو دیتی ہے) یہ سن کر آپؐ نے انہیں ہدایت فرمائی: ((فَاَجِبْ))[1] ’’تو پھر اس کا جواب دیا کرو‘‘۔ یعنی پھر تو تمہیں مسجد آنا ہی چاہیے۔ اس حدیث سے اندازہ لگائیے کہ عام اور معمولی عذرات کی بات اللہ و رسول ﷺ کی نظر میں کتنی بے وزن ٹھہرا کرتی ہوگی!

فقہی رخصتوں کا معاملہ بھی عذرات کے معاملے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اصحابِ

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ‘ باب یجب اتیان المسجد علی من سمع النداء۔

امرکوان رخصتوں سے فائدہ اٹھانا بالکل زیب نہیں دیتا' اِلّا آ نکہ خود شریعت ہی نے کسی رخصت پر عمل کرنے کو واجب یا مستحسن قرار دے رکھا ہو۔ رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کا مزاج دراصل دینی مزاج کی خامی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ دینی مزاج کی خامی ایک عام مسلمان اور ایک عام فردِ تنظیم کے حق میں بھی کچھ کم افسوس ناک چیز نہیں' لیکن تحریک اسلامی کے اصحابِ امر کے حق میں تو اسے قابلِ ملامت ہی کہا جائے گا' کیونکہ اس خامی کے اثرات صرف انہی کی ذات تک محدود نہ رہیں گے' بلکہ اس کا کچھ نہ کچھ اثر ان کے مأمورین پر بھی پڑ کر رہے گا' اور یہ تحریک کا اتنا بڑا زیاں ہوگا جسے کوئی بھی حساس شخص انگیز کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔

(۲) اصحابِ امر کا مأمورین کے ساتھ رویہ

یہ تو وہ خاص خاص اہم باتیں تھیں جو اصحابِ امر کے اپنے احتسابِ نفس اور اپنی اصلاحِ ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ان ذمہ داریوں کی طرف آیئے جو اُن پر اُن کے مأمورین کی نسبت سے عائد ہوتی ہیں' تاکہ معلوم ہوجائے کہ اصحابِ امر کو اپنے منصبی فرائض انجام دینے کے لیے کن صفات سے خاص طور پر متصف ہونا اور کن طور طریقوں پر کاربند رہنا ضروری ہے۔

اس بحث کے سلسلے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ اصحابِ امر اور ان کے مأمورین کے درمیان ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کا واضح اصولی جواب رسول اکرم ﷺ کے اس مشہور ارشاد میں موجود ہے:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهِ ، اَلْاِمَامُ رَاعٍ وَّمَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ.....الخ)) (۱)

''تم میں کا ہر شخص راعی اور نگران ہے اور تم سب کو اپنی رعیّتوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ مسلمانوں کا سربراہ ایک راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا.....''

یہ فرما کر آپ ﷺ نے چند اور اقسام کے راعیوں اور ان کی رعیّتوں کی نام بہ نام مثالیں دے کر بات کو پوری طرح واضح کر دیا۔ اس ارشادِ نبویؐ کے مطابق تحریکوں کے ذمہ دار اور اصحابِ امر بھی ایک خاص نوعیت کے راعی اور نگران قرار پاتے ہیں' اور دنیا اور آخرت دونوں

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب الجمعة فی القری والمدن۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضیلة الامام العادل وعقوبة الجائر والحث علی الرفق۔

ہی جگہ وہ اپنی اپنی رعیّتوں کے یعنی اپنے مأمورین اور اپنے زیرنگرانی افرادِتحریک کے بارے میں جواب دہ ٹھہرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے جو راتوں کی نیند اڑا دے سکتی ہے' لیکن ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کی انجام دہی کا اجر بھی بہت بڑا ہے۔

یہاں اس بھاری ذمہ داری کی نوعیت بھی سمجھ لینی چاہیے۔ یہ ایک واضح اصولی بات ہے کہ مختلف قسم کے راعیوں کی ذمہ داریاں مختلف نوعیّتوں کی ہوں گی جن کا تعین ان راعیوں کی رعیّتوں کے مفاد اور مصالح کی بنیاد ہی پر ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں تحریکی ذمہ داریاں اور مسئولیتیں اپنے مأمورین کے تئیں اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتیں کہ جس مقصد کی خاطر یہ لوگ ان کی رہنمائی اور نگرانی میں دیے گئے ہیں وہ انہیں اس مقصد کے کام کے آدمی بنائیں' ان کے اندر اپنے تحریکی نصب العین کے حق میں زیادہ سے زیادہ ذہنی یکسوئی پیدا کریں اور اس کی خاطر جدوجہد کا حوصلہ پروان چڑھائیں' ان انفرادی اور اجتماعی اوصاف سے انہیں بیش از بیش آراستہ کرتے رہنے کی فکر اور کوشش کریں جو تحریک کو مطلوب اور اللہ اور اس کے رسولؐ کو محبوب ہیں۔

اصحابِ امر اور مأمورین کے درمیان تحریکی تعلق کی نوعیت اور اس کے تقاضے معلوم ہوجانے کے بعد اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اُن صفات سے جن کا حامل ہونا اور ان رویوں سے جن کا اختیار کرنا اصحابِ امر کے لیے ضروری ہے' واقفیت حاصل کرلی جائے۔

(i) نرم خوئی ونرم گیری: پہلی ضروری چیز نرمی اور لیّنت کی صفت ہے۔ اصحابِ امر کو اپنے مأمورین کے ساتھ ممکن حد تک نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے' اور اگر کبھی خود مفادِتحریک کا تقاضا ہو کہ ان پر گرفت کی جائے تو اس گرفت میں بھی حتی الوسع سخت گیری سے بچنا چاہیے۔ پھر اتنی بات بھی کافی نہیں ہے کہ یہ نرم رویہ محض تدبیر اور پالیسی کے طور پر اپنا لیا گیا ہو' بلکہ مطلوب یہ ہے کہ یہ تا حد امکان ان کا مزاج بن گیا ہو۔ یہ روش اور صفت سب سے زیادہ جس چیز کے لیے اہمیت رکھتی ہے وہ تحریک کی ہیئت اجتماعیہ ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ہیئت اجتماعیہ اپنی صحت اور اپنے اندرونی استحکام کے لیے بڑی حد تک اصحابِ امر کی اسی نرم روی پر انحصار کرتی ہے۔ جہاں کسی تحریک کا اجتماعی نظم اپنے اس سامانِ بقاء سے محروم ہوا اس کا نظامِ اعصاب اسی طرح ٹوٹ کر رہ جائے گا جس طرح کسی زلزلے کے بعد پختہ عمارتیں بھی اندر سے چٹخ کر رہ جاتی ہیں۔ انسانی فطرت کے خالق نے کسی اور کو نہیں' خود اپنے پیغمبر اعظم ﷺ کو ایک بڑے اہم واقعہ کے بعد مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''سو یہ اللہ ہی کی مہربانی تھی کہ تم (اپنے) اِن (ساتھی اہل ایمان) کے لیے نرم ہو‘ ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے لازماً چھٹ گئے ہوتے''۔

سوچیے اور بار بار سوچیے کہ جب تندخوئی اور سخت دلی کے ساتھ رسالت پناہ جیسی عظیم اور بے مثال شخصیت کے لیے بھی اپنے لوگوں کی جمعیت کو برقرار رکھ سکنا ممکن نہ ہوتا تو دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں؟ معلوم ہوا کہ نرم مزاجی جہاں انسان کی سیرت کا ایک دلکش حسن ہے‘ وہاں اپنوں کو مضبوطی سے جوڑے رکھنے کا ایک ناگزیر ذریعہ بھی ہے۔ اس کے بغیر تحریک کا اجتماعی نظم پائیدار ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ نرم خوئی کس پائے کی ایمانی صفت ہے‘ اسے جاننے اور سمجھنے کے لیے قرآن کریم کا یہ بیان کافی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی نرم مزاجی تو فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت کا خاص عطیہ تھی۔ آنحضرت ﷺ نے بھی اس وصف کی غیر معمولی اہمیت کا اظہار اِن لفظوں میں کیا ہے:

((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ)) (۱)

''جو شخص نرم مزاجی سے محروم ہو وہ (گویا ہر طرح کی) بھلائی سے محروم ہے''۔

غور کیجیے کہ جب نرم مزاجی سے محرومی آدمی کی اپنی شخصی زندگی میں ساری بھلائیوں سے محرومی کا باعث بن جاتی ہے تو یہ جماعتی زندگی کے لیے کیا کچھ مصیبتیں نہ پیدا کر دے گی‘ اگر خدانخواستہ اس کے اصحابِ امر اس محرومی کا شکار ہوں!

نرم خوئی‘ رفق اور لیّنت سے محرومی کے معنی تندخوئی اور سخت گیری کے ہیں۔ سخت مزاج امراء و حکام نبی اکرم ﷺ کی نگاہ میں اتنے بڑے مجرم ہیں کہ رحمۃٌ للعالمین اور رؤف و رحیم ہونے کے باوجود آپؐ اُن کے حق میں دلوں کو ہلا دینے والی یہ بددعا کرنے پر مجبور ہو گئے:

((اَللّٰهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِيْ شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ فَاشْقُقْ عَلَيْهِ)) (۲)

''اے اللہ! جو کوئی میری اُمت کے کسی معاملے کا ذمہ دار ہو اور وہ لوگوں پر سختی کرے تو تُو اس پر سختی کر''۔

سختی اور سخت گیری کا یہ ہولناک انجام سامنے رکھیے تو نرمی اور نرم خوئی کی قدر و قیمت آپ سے آپ معلوم ہو جائے گی۔

---

(۱) صحيح مسلم‘ كتاب البر والصلة والآداب‘ باب فضل الرفق۔

(۲) صحيح مسلم‘ كتاب الامارة‘ باب فضيلة الامام العادل وعقوبة الجائر والحث على الرفق۔

(ii) عفو و درگزر: نرم خوئی اور لیّنت سے نہایت قریبی تعلق رکھنے والی ایک خاص صفت جماعتی معاملات میں عفو و درگزر سے کام لینے کی صفت ہے' جس سے اصحابِ امر کا خصوصیت سے متصف رہنا انتہائی ضروری ہے۔ عفو و درگزر کی مدح و منقبت سے اور اس کی ترغیب و تاکید سے کتابِ الٰہی بھری پڑی ہے' اور رسولِ خدا ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اس کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی سے لڑائی کا پانسہ یکایک مشرکوں کے حق میں پلٹ گیا تھا اور اس کے نتیجے میں بہت سے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شہادت کا اور خود نبی اکرم ﷺ کے زخمی ہو جانے کا المناک سانحہ پیش آ گیا تھا۔ مسلمانوں کی یہ غلطی کوئی معمولی غلطی نہ تھی۔ دنیا کا کوئی اور سپہ سالار ہوتا تو ایسے لوگوں کا کورٹ مارشل کر کے انہیں بدترین سزائیں دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑتا۔ لیکن حضور اکرم ﷺ نے اپنے ان خطا کار لشکریوں کے حق میں کسی اقدام کی بات سوچی تک نہ تھی اور عفو عام سے کام لیا' جس کی اللہ تعالیٰ نے نہ صرف تصویب فرمائی' بلکہ تحسین بھی کی اور اسے اپنی رحمت کا ثمرہ قرار دیا۔ جیسا کہ آپ ابھی ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ﴾ کے الفاظِ الٰہی میں سن چکے ہیں۔ اور پھر اس تحسین ہی پر اکتفا نہیں کر لیا بلکہ ساتھ ہی آپؐ کو اس بات کی ہدایت بھی کی کہ:

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

''پس انہیں معاف کر دو اور ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو' اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو''۔

مقصود اس ہدایت کا یہ تھا کہ انہیں معاف کرنے ہی تک اپنی روش کو محدود نہ رکھیے' بلکہ آگے بھی ایسا رویہ اختیار کیجیے جس سے انہیں اطمینان ہو جائے کہ یہ معافی کوئی رسمی اور قانونی معافی نہیں ہے بلکہ حقیقی معافی ہے' زبانِ مبارک ہی نے نہیں قلبِ اطہر نے بھی انہیں معاف کر دیا ہے اور اب ان سے سرزد ہو جانے والی غلطی کا کوئی انقباضی اثر آپؐ پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ مقتدائے عالم ﷺ کو دی جانے والی اس ہدایت میں عام افرادِ اُمت کے لیے بالعموم اور کسی طرح کی جماعتی ذمہ داریاں رکھنے والوں کے لیے بالخصوص رہنمائی کا پورا سامان موجود ہے۔ یہ اس امر کی کھلی ہوئی تلقین ہے کہ جماعتی معاملات میں اگر عام افراد سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اصحابِ امر کو عفو و درگزر سے کام لینا چاہیے' اور یہ کہ یہ عفو و درگزر صدقِ دل سے ہو' محض قانونی انداز کا نہ ہو۔ بلاشبہ یہ کوئی لازمی کلیہ نہیں ہے اور بعض اوقات خود تحریک ہی کا

مفاد تقاضا کرتا ہے کہ اس موقع پر سرزنش سے کام لیا جائے' لیکن یہ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں۔ عام روش عفو و درگزر ہی کی رہنی چاہیے' اس کے بغیر جماعتی نظم میں باہمی حسن تعلق قائم نہیں رہ سکتا۔

(iii) صبر و تحمل: نرم خوئی سے ایسا ہی قریبی تعلق رکھنے والی ایک اور بھی ضروری صفت صبر و تحمل کی صفت ہے۔ یہاں صبر و تحمل سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات پر ناروا حملوں کے موقع پر اپنا غصہ پی جائے۔ اشتعال انگیز حالات میں برداشت سے کام لینا عام طور سے بہت مشکل ہوتا ہے' مگر جس قدر یہ چیز کڑوی ہے اسی قدر اس کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ تحریکی زندگی کے لیے تو یہ پھل مقوی غذا کی حیثیت رکھتا ہے۔ کسی اسلامی تحریک کے سربراہ اگر خدانخواستہ اپنے اندر صبر و تحمل کا مادہ نہ رکھتے ہوں تو صرف ان کی اپنی ذات ہی نہیں' تحریک بھی اس کا خمیازہ بھگتنے سے نہیں بچ سکتی۔ اصحابِ امر کو اپنی ذات پر ہونے والی ناروا تنقیدوں سے سابقہ پیش آنا کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ ہر تنظیم میں ایسے خام کار لوگ موجود ہوا ہی کرتے ہیں جو حدود کا لحاظ نہیں رکھ پاتے۔ ایسے لوگوں کی طرف سے اگر اشتعال انگیز حرکتیں ہو جائیں تو ان پر غصہ کا آنا فطری ہے اور یہ شرعاً بھی کوئی مذموم چیز نہیں ہے۔ مذموم بات صرف یہ ہے کہ غصہ کے عالم میں صبر و تحمل کا دامن چھوڑ دیا جائے۔ زندگی کے ہر معاملے کی طرح اس معاملے میں بھی نبی اکرم ﷺ کا اُسوہ ایک مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہے۔ آپؐ کی پوری زندگی بتاتی ہے کہ آپؐ نے اپنی ذات کے خلاف ہونے والی کسی زیادتی کا کبھی انتقام نہیں لیا' بلکہ ہر بات پر صبر کیا۔ مثال کے طور پر دو واقعات کا سن لینا کافی ہوگا۔ پہلا واقعہ غزوۂ حنین کے موقع کا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جنگِ حنین میں حاصل ہونے والے اموالِ غنیمت کو رسول اللہ ﷺ نے جب لوگوں میں تقسیم کیا تو (دعوتِ اسلامی کے پیش نظر) کچھ اشرافِ عرب کو باقی لوگوں پر اس معاملے میں ترجیح دی اور انہیں نسبتاً زیادہ دیا۔ ایک اَن گھڑ شخص نے یہ دیکھ کر یہاں تک کہہ دیا کہ: وَاللّٰہِ اِنَّ ھٰذِہِ الْقِسْمَۃُ مَا عُدِلَ فِیْھَا وَمَا اُرِیْدَ فِیْھَا وَجْہُ اللّٰہِ (بخدا یہ ایک غیر عادلانہ تقسیم ہے اور اس میں اللہ کی رضا کو ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے)۔ جب آپؐ تک یہ بات پہنچی تو چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا' یہاں تک کہ سرخ رنگ کی طرح لال ہو گیا' مگر صرف اتنا فرما کر آپؐ خاموش ہو رہے کہ:

((فَمَنْ یَعْدِلُ اِذَا لَمْ یَعْدِلِ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ' رَحِمَ اللّٰہُ مُوْسٰی قَدْ اُوْذِیَ بِاَکْثَرَ

مِنْ هٰذَا فَصَبَرَ)) (۱)

''اگر اللہ اور اس کا رسول ہی عدل نہ کریں گے تو پھر اور کون کرسکتا ہے؟'' پھر فرمایا:

''اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام کو اپنی رحمت سے نوازے' ان کی اس سے بھی بڑھ کر دل آزاری کی گئی تھی' مگر انہوں نے ہر بات پر صبر کیا''۔

دوسرا واقعہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائے جانے والے بہتانِ عظیم کا ہے۔ اس واقعے کے نتیجے میں مسلسل ایک ماہ تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قلبی اذیت کے ساتھ زندگی کے شب و روز گزارے اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ مگر اتنا کچھ ہو جانے پر بھی صبر و تحمل کے اس پیکرِ مقدس نے ایسی عالی ظرفی سے کام لیا جس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ دونوں واقعات ایسا آئینہ ہیں جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ صبر و تحمل کی پوری کیفیت دیکھ لی جا سکتی ہے۔ آپؐ کے اس اُسوے میں افراد ہی کی ایمانی زندگی کا نہیں' جماعت کی بھی اندرونی صحت و توانائی کا راز چھپا ہوا ہے۔

(iv) **فروتنی**: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کے اہل ایمان اصحاب رضی اللہ عنہم کے سلسلے میں جو مختلف ہدایتیں دی تھیں ان میں سے ایک اہم ہدایت یہ بھی تھی کہ:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشُّعراء)

''اور اپنے اہل ایمان پیروؤں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھو''۔

''بازوؤں کو جھکائے رکھو'' یعنی فروتنی اور تواضع کا رویہ اپنائے رکھو۔ تواضع اگرچہ بجائے خود ایک اعلیٰ انسانی جوہر اور ایمانی صفت ہے' لیکن آیت کا موقع کلام اور اس کے الفاظ بتاتے ہیں کہ یہاں آپؐ کو اس کی تلقین دعوتِ اسلامی کے مفاد کے حصول میں کی گئی ہے اور یہ مفادِ دعوت یہ تھا کہ آپؐ کا یہ متواضعانہ رویہ پیروانِ اسلام کے اندر آپؐ کی ذات اور دعوت دونوں سے گرویدگی پیدا کرے گا۔ جب حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے داعیٔ حق اور سربراہ کو بھی اپنے نصب العین کی خاطر کامیاب جدوجہد کرنے کے لیے اپنے پیروؤں کے ساتھ فروتنی کا رویہ اختیار کرنے کی ضرورت تھی تو دوسروں کو یقینی طور پر بدرجۂ اولیٰ ہوگی' اور اس سے صرفِ نظر کر کے کوئی سربراہ بھی اپنے تحریکی منصب کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

(۱) صحیح البخاری' کتاب فرض الخمس' باب ما کان النبی ﷺ یعطی المؤلفة قلوبهم وغیرهم..... وصحیح مسلم' کتاب الزکاة' باب اعطاء المؤلفة قلوبهم علی الاسلام وتصبر من قوی۔

لیکن فروتنی وخود شکنی کی روش اختیار کیے رہنا جتنا ضروری ہے اتنا ہی مشکل بھی ہے‘ اور عام لوگوں کے مقابلے میں ان لوگوں کے لیے تو اور زیادہ مشکل ہے جو کوئی نمایاں پوزیشن رکھتے ہوں‘ کیونکہ یہ پوزیشن ان کے لیے ایک فتنہ بن جانے کے بڑے امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے تحریکی سربراہوں کے لیے اس خلق کریم سے بہرہ ور ہونا بڑا ذہنی ریاض چاہتا ہے۔ اس ذہنی ریاض کی پہلی ضروری تدبیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کی صحیح نوعیت کا گہرا شعور حاصل ہو۔ پھر یاد کر لیجیے کہ کسی اسلامی تحریک میں مناصب کی حیثیت اصلاً نہ تو کسی استحقاق کی ہوتی ہے نہ کسی اعزاز کی ہوتی ہے‘ بلکہ ایک ہمت آزما بھاری ذمہ داری کی ہوتی ہے۔ اصحابِ امر کی فروتنی‘ اگر وہ فی الواقع فروتنی ہو‘ وہ کیمیا ہے جو انہیں زرِ خالص بنا دینے میں بڑا اہم رول انجام دیتی ہے۔ یہ بظاہر ایک پستی ہوتی ہے‘ مگر فی الواقع عظمت کا نشان ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بشارت دی ہے کہ:

((مَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ)) (۱)

’’جو شخص اللہ کے لیے متواضعانہ روش اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلند کر کے رہتا ہے۔‘‘

فروتنی اور تواضع کا یہ ثمرہ آدمی کی اپنی ذات کو تو ملتا ہی ہے‘ تحریک کو اس کا فائدہ اس سے بھی بڑھ کر ملتا ہے۔ ایسے اصحابِ امر اپنے مأمورین کی نگاہوں کا تارا بن جاتے ہیں‘ اور ان کی امارت ان لوگوں کے ظاہر ہی کی طرح ان کے دلوں اور دماغوں پر بھی قائم ہو جاتی ہے اور فی الواقع ایسے ہی اصحابِ امر وہ اصحابِ امر ہوتے ہیں جو اپنے مأمورین کے اندر طاعت امر اور دعوتی جدوجہد کا ولولہ پیدا کر سکتے ہیں‘ اسے بیدار رکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے مسلمانوں کے اچھے امراء اور حکام انہیں قرار دیا ہے جن سے ان کو دلی محبت ہو۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ)) (۲)

’’تمہارے اچھے امام و پیشوا وہ ہیں جن کو تم محبوب رکھو اور جو تم سے محبت رکھیں‘ جن کے لیے تم دعائے رحمت کیا کرو اور جو تمہارے لیے دعائے رحمت کیا کریں۔‘‘

جیسا کہ ابھی اشارہ کیا جا چکا‘ امراء و ذمہ دارانِ تحریک کے لیے محبوبیت کے اس مقام کا

(۱) صحیح مسلم‘ کتاب البر والصلة والآداب‘ باب استحباب العفو والتواضع۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الامارة‘ باب خیار الائمة وشرارهم۔

حاصل ہونا بہت کچھ ان کے متواضعانہ رویے پر موقوف ہے۔

(۷) مأ مورین کی خیر خواہی: اپنے زیر امارت افراد کی دلی خیر خواہی بھی ان خاص اور اہم صفات میں سے ایک ہے جن سے ذمہ دارانِ تحریک کا متصف رہنا ضروری ہے، ورنہ وہ کبھی کامیاب صاحبِ امر نہیں بن سکتے۔ یہ ان کے عین منصب کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے مأ مورین کی بہی خواہی کو اپنے فکر و عمل کا جزو بنائے رکھیں، جہاں تک ممکن ہو ان کے نجی حالات سے بھی بے خبر نہ رہیں۔ اور اگر وہ کسی مشکل سے دوچار ہوں تو اس کے حل میں ان کی لازماً معاونت کریں۔ یہ ان کی شرعی ذمہ داری ہے۔ نبی ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

((مَا مِنْ اَمِيْرٍ يَلِيْ اَمْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ثُمَّ لَا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ اِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ)) (۱)

''ہر وہ امیر جو مسلمانوں کے معاملات کا نگران و ذمہ دار ہو، مگر وہ ان کے (بھلے کے) لیے جدوجہد نہ کرے، نہ ان کی خیر خواہی کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا''۔

اور یہ کہ:

((مَنْ وَلَّاهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ شَيْئًا مِنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمُ احْتَجَبَ اللّٰهُ عَنْهُ دُوْنَ حَاجَتِهِ وَخَلَّتِهِ وَفَقْرِهٖ)) (۲)

''جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے کسی معاملے کا بھی والی و انتظام کار بنایا ہو وہ اگر ان کی ضرورتوں، حاجت مندیوں اور ناداریوں کے مسائل اپنے تک نہ پہنچنے دے تو قیامت کے دن اللہ اس کی ضرورتوں، حاجت مندیوں اور ناداریوں کی طرف سے پردہ کرے گا''۔

اپنے مأ مورین کے ساتھ خیر خواہی کا رویہ اختیار کرنے کی یہ اہمیت تو اُخروی نقطۂ نگاہ سے ہے۔ تحریکی اور تنظیمی نقطۂ نگاہ سے اس کی اہمیت یہ ہے کہ مأ مورین کی نفسیات پر اس کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے۔ ایک طرف تو اپنے ذمہ داروں کے ساتھ ان کی محبت اور الفت میں اضافہ

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب استحقاق الوالی الغاش لرعیته النار۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والامارة والفیء، باب فیما یلزم الامام من امر الرعیة والحجبة عنه۔

ہوتا ہے۔ دوسری طرف تحریک کے فروغ کے لیے ان کے اندر ایثار و قربانی کا جذبہ متحرک سے متحرک تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں نتائج اُلٹے نکلتے ہیں۔ ذمہ داروں اور مأمورین کے درمیان وہ قربت باقی نہیں رہتی جو رہنی چاہیے اور پھر تحریک کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے طرزِ عمل کو یاد کیجیے۔ آپؐ عامۃ المسلمین کے ساتھ جس محبت، شفقت اور بہی خواہی کا برتاؤ کرتے تھے اور ان کی ضرورتوں اور مصلحتوں کا جتنا خیال رکھتے تھے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کر لیجیے۔ صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ایک صحابیؓ کا یہ بیان مذکور ہے کہ ''ہم کچھ نوجوان، جو سب کے سب تقریباً یکساں عمر کے تھے، خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور آپؐ کے پاس بیس روز تک ٹھہرے رہے۔ رسول اللہ ﷺ بڑے رحم دل اور رقیق القلب تھے۔ آپؐ نے از خود محسوس کر لیا کہ ہمیں اپنے اہل و عیال کی یاد آ رہی ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی آپؐ نے ہم سے دریافت فرمایا کہ ''تم لوگ اپنے گھروں پر کن کن کو چھوڑ کر آئے ہو؟'' ہم نے جو بات تھی بتا دی۔ صورتِ حال معلوم کر کے آپؐ نے ارشاد فرمایا:

((اِرْجِعُوْا اِلٰی اَھْلِیْکُمْ فَاَقِیْمُوْا فِیْھِمْ وَعَلِّمُوْھُمْ وَمُرُوْھُمْ))(۱)

''اپنے اہل و عیال کے پاس واپس جاؤ، ان کے درمیان مقیم رہو، اور انہیں دین سکھاتے رہو اور اچھے کاموں کی تلقین کرتے رہو۔''

(vi) **اصلاح و تربیت کا حکیمانہ انداز**: قرآن کریم نے دعوت الی اللہ کے جو اصولی طریقے تلقین فرمائے ہیں ان میں سے ایک ''موعظة حسنة'' کا اصول بھی ہے۔ اس ''موعظت حسنہ'' کے اصول کو اسلامی تحریکوں کے نظامِ تربیت کی ریڑھ کی ہڈی سمجھنا چاہیے۔ پند و نصیحت اگر مخلصانہ اور دردمندانہ ہونے کے ساتھ ساتھ حکمت کا انداز بھی لیے ہوئے ہو تو اپنا اثر دکھا کر رہتی ہے اور اصلاح و تربیت کے سو پروگراموں اور رسمی تدبیروں پر بھاری ثابت ہوتی ہے۔ مربیٔ اعظم ﷺ اصلاح و تربیت کا عام طور سے جو طریقہ اپنایا کرتے تھے اور اس کے جو نتائج نکلتے تھے اس کی صرف دو مثالیں سن لیجیے۔ سنن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے حضرت خریم الاسدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا:

((نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَیْمٌ الْاَسَدِیُّ لَوْ لَا طُوْلُ جُمَّتِہٖ وَاِسْبَالُ اِزَارِہٖ))(۲)

''خریم بڑے اچھے آدمی ہیں، کاش ان کے بالوں کی لٹ اتنی لمبی اور ان کی تہبند نیچے

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة والاقامة وکذلك۔ وصحیح مسلم، کتاب المساجد ومواضع الصلوٰة، باب من احق بالامامة۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب اللباس، باب ما جاء فی اسبال الازار۔

تک لٹکتی نہ ہوتی!''

نتیجہ اس طرزِ تربیت کا حسب توقع یہ نکلا کہ آپ ﷺ کے یہ الفاظ حضرت خریمؓ تک پہنچے تو دل میں تیر بن کر اُتر گئے' انہوں نے ایک چھری اٹھائی اور اپنی لٹوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ اسی طرح بخاری شریف کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنے ایک صحابی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا:

((نِعْمَ الرَّجُلُ عَبْدُ اللّٰهِ لَوْ كَانَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ))(۱)

''عبداللہ خوب آدمی ہیں' کیا اچھا ہوتا کہ وہ رات میں نماز بھی پڑھا کرتے۔''

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو جب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد معلوم ہوا تو ذہن نے معاً فیصلہ کرلیا اور پھر وہ راتوں میں کم سونے لگے۔

آدمی جن خامیوں کا شکار ہوتا ہے اور جن کی اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو کردار کی خامی' دوسرے اندازِ فکر کی خامی۔ کردار کی خامی کی اصلاح کے سلسلے میں حضور ﷺ کا انداز بالعموم ایسا ہی حکیمانہ اور مشفقانہ ہوا کرتا تھا۔ البتہ اندازِ فکر کی خامی آپؐ کی نگاہ میں زیادہ قابل توجہ اور قابلِ گرفت قرار پاتی تھی۔ اس لیے اس کی اصلاح کے اندر حکمت کے ساتھ تنبیہہ اور قدرے زجر و توبیخ کا عنصر بھی شامل ہوا کرتا تھا' اور وہ بالعموم ''مَا بَالُ اَقْوَامٍ'' کے لفظوں سے شروع ہوتا تھا۔ یعنی آپؐ ایسے مواقع پر یوں فرمایا کرتے تھے کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا ایسا کرتے یا ایسا ایسا کہتے ہیں! گویا ایسے مواقع پر بھی آپؐ فکری خامی کا مظاہرہ کرنے والوں کے نام لیے بغیر نصیحت اور تنبیہہ بالکل عمومی انداز میں فرمایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اندازِ کلام آپؐ اس مصلحت کی خاطر اختیار فرماتے کہ لوگوں میں کہیں ناگواری کا جذبہ نہ ابھر آئے اور اس طرح نصیحت و تنبیہہ کا مقصد ہی فوت ہو کر نہ رہ جائے۔

اصلاح و تربیت کے بارے میں ہمیں بھی اِسی اُسوے کی پیروی کرنی چاہیے' کیونکہ اس اندازِ تربیت سے بہتر انداز دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین oo

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب فضل قیام اللیل۔ وصحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابة' باب فقه فضائل عبد اللّٰه بن عمر۔

حسنِ معاشرت

خوش طبعی اور مزاح

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

خالق کائنات نے انسان کو تخلیق کیا تو اُس نے اپنی مشیت کے تحت اسے کمزور پیدا کیا۔ اس کے اندر جذبات' احساسات اور فطری تقاضے رکھے۔ انسان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ اپنے فطری تقاضوں پر کڑی نظر رکھے' انہیں کنٹرول کرے اور آزاد نہ چھوڑے۔ یہی انسان کا امتحان ہے کہ آیا وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے یا جذبات کو قابو میں رکھ کر ہدایت کی راہ پر چلتا ہے۔ جو اس کوشش میں کامیاب ہو گیا وہی مردِ میدان ہے' وہی حقیقی کامیاب انسان ہے۔

اسلام فطری داعیات کو کنٹرول کرنے کی تلقین کرتا ہے' کچلنے کی نہیں۔ انسان کے اندر محبت کے جذبات و داعیات ہیں۔ پس اُسے ماں' باپ' اہل و عیال' تمام مسلمان بھائیوں' خصوصاً رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ محبت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان کے اندر نفرت کے داعیات بھی ہیں۔ چنانچہ اُسے ان جذبات کی تشفی کے لیے برے اعمال و افعال' ممنوعات' مکروہات' کفر و شرک اور برے انسانوں سے نفرت کرنے کو کہا گیا ہے۔ انسان کے اندر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے جذبات ہیں۔ ان کو کام میں لانے کے لیے نیکیوں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت لے جانے کے راستے کھلے رکھے گئے ہیں۔ دولت کی محبت کو متوازن رکھنے کے لیے اچھی خوراک' اچھا لباس' اچھی رہائش' اچھی سواری اور دنیاوی ضرورت کی چیزوں پر خرچ کرنے کی اجازت دی گئی ہے' مگر نمود و نمائش کی خاطر فضول رسموں اور اسراف و تبذیر سے روکا گیا ہے۔

خوشی کے موقع پر خوشی کے اظہار اور غم کے موقع پر غمزدہ ہونے سے نہیں روکا گیا' البتہ خوشی کے موقع پر حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ناچ گانے' فضول خرچی اور لہو و لعب سے روکا گیا ہے۔ اسی طرح کسی صدمے کی صورت میں افسردہ ہونے سے نہیں روکا گیا' البتہ بے صبری کے مظاہرے' چیخنا' چلانا' شکوہ شکایت سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ خوشیاں اور غم انسان

کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' ان سے فرار کسی طرح ممکن نہیں۔ پس حدود کے اندر رہ کر خوشی منانا اور غم کے موقع پر غمزدہ ہونے سے نہیں روکا گیا۔ غضب ناک ہونا' غصہ میں آنا' پنجہ آزمائی' لڑنا بھڑنا بھی بعض طبائع میں پایا جاتا ہے۔ ان جذبات کے اظہار کو بھی راہ دی گئی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے دشمن اگر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کریں تو ان کو کچلنے کے لیے میدان میں اُترو اور اپنے جذبات کا اظہار کرو' مگر اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ لڑائی بھڑائی سے بچتے رہو۔ ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

فطری جذبات میں ہنسنا' مسکرانا' خوش طبعی اور مزاح بھی شامل ہے۔ اس سے انسانی طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔ خوشی کی بات ہو تو ہنسنے مسکرانے پر پابندی نہیں۔ آپس میں خوش طبعی اور مزاح کی باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ سے مزاح اور خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔ جب خوش طبعی اور مزاح سیرتِ طیبہ میں موجود ہے تو اس کی پیروی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعین' تبع تابعینؒ اور اُمت کے صالحین کی زندگیوں میں بھی خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے مذاق کرنے سے منع بھی کیا ہے' مگر یہ وہ مذاق ہے جس میں کسی کی اہانت اور تحقیر ہو۔

اگر ہر وقت سنجیدگی کا غلبہ ہو تو زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔ کبھی کبھی خوش طبعی' ہنسی مذاق' مزاح اور شگفتہ گفتگو طبیعت میں فرح اور انبساط کا باعث بنتی ہے۔ البتہ ان جذبات کا بے محابہ اظہار مذموم ہے۔ اسی لیے ایسا مزاح جس میں خلافِ حقیقت باتیں' کذب وافترا اور جہالت ہو' اس کی اجازت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر فکرِ آخرت کا غلبہ تھا۔ آپؐ ہمیشہ فکر مند اور غمگین رہا کرتے تھے۔ بایں ہمہ سیرتِ طیبہ میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مزاح کا اظہار بھی ملتا ہے' جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہمت ملتی تھی کہ وہ آپؐ کے رعب وادب کے باوجود بے تکلفی کے ساتھ آپؐ سے بات چیت کر لیتے تھے۔ اسلام میں نفس کے حقوق بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔ اور نفس کا ایک حق یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی انسان سنجیدگی سے نکلے اور ہنسے مسکرائے' خوش طبعی' دل لگی کی باتیں کرے اور فرحت محسوس کرے۔ سیرتِ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام اور سوانح صحابہؓ میں خوش طبعی کے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ واقعات اصولِ شریعہ بھی متعین کرتے ہیں' خوش

طبعی کا باعث بھی ہیں اور علم و ذہانت بھی بڑھاتے ہیں۔

۞ حضرت ابو ہریرہ ؓ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام ؓ نے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں' مگر میں کبھی غلط بات نہیں کرتا''۔ (ترمذی)

۞ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے خادمِ خاص حضرت انس ؓ کو یَاذَا الْاُذُنَیْن سے خطاب فرمایا' یعنی دو کانوں والا۔ آپؐ کا یہ خطاب بے تکلفی' پیار اور از راہِ مذاق تھا' مگر یہ کوئی حقیقت کے خلاف بات نہ تھی۔ ہر شخص کی طرح حضرت انس ؓ کے بھی دو (۲) کان تھے۔ پھر ہو سکتا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہو کہ انسؓ ہر بات متوجہ ہو کر سنتے تھے اور جو بھی ارشادِ نبویؐ سنتے تھے اس کے سننے کا حق ادا کرتے تھے' یعنی اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

۞ حضرت اَنس ؓ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی نے ایک پرندہ پالا ہوا تھا جس کے ساتھ وہ کھیلتا تھا۔ وہ پرندہ مر گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے چھوٹے بھائی کو از راہِ مذاق فرمایا: یَا اَبَا عُمَیْر مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ ''اے ابوعمیر! وہ نغیر کہاں جاتا رہا؟'' حالانکہ آپؐ جانتے تھے کہ وہ پرندہ مر گیا ہے۔ ظاہر ہے آپؐ نے حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کو بے تکلفی' موانست اور پیار کی وجہ سے ان الفاظ کے ساتھ پکارا۔ فقہاء نے تو آپؐ کے اس طرح کے مزاحیہ جملوں سے کئی مسائل کا استخراج کیا ہے۔ گویا آپؐ کا مزاح بھی حکیمانہ اور معلمانہ ہوتا تھا۔

۞ زاہر بن حرام ؓ نامی ایک صحابی دیہاتی آبادی سے رسول اللہ ﷺ کے ہاں آتے اور اپنے ساتھ آپ ﷺ کے لیے سبزی ترکاری لایا کرتے۔ جب واپس ہوتے تو آپؐ انہیں کھانے پینے کا کچھ شہری سامان عطا فرماتے۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا: ''زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں''۔

۞ حضرت زاہر ؓ کے ساتھ آپؐ کی بے تکلفی اور تعلق خاطر ملاحظہ ہو کہ ایک دفعہ آپؐ نے انہیں بازار میں دیکھا تو پیچھے سے جا کر اُن کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت زاہرؓ پکارے کون ہے؟ کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں سے ہاتھ اٹھا لیا اور فرمایا: ''کون شخص ہے جو اس غلام کو خریدے!'' زاہرؓ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اگر آپ مجھے بیچیں گے تو بہت کم قیمت پائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں' تم اللہ کے نزدیک کم قیمت نہیں' بلکہ

بیش قیمت ہو!‘‘

۞ ایک بوڑھی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی۔ دورانِ گفتگو آپؐ نے فرمایا: ’’کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی‘‘۔ یہ سن کر وہ عورت حیران اور فکر مند ہوئی۔ جب اس کی حیرت پریشانی کی حدود میں آنے لگی تو آپؐ نے فرمایا کہ ’’جنت میں سب عورتیں جوان ہوکر جائیں گی‘ وہاں کوئی بوڑھی نہ ہوگی‘‘۔ یہ سن کر اس عورت کو اطمینان ہوا‘ اُس کی فکر مندی خوشی میں بدل گئی اور وہ مسکرانے لگی۔ اس مزاح سے جہاں خوش طبعی کا اظہار ہوا وہاں اُمت کو علم وحکمت کا سبق بھی ملا کہ بسا اوقات آدمی آیت وروایت کے غلط معنی سمجھ لیتا ہے‘ جیسا کہ بڑھیا نے ((لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ)) سے ظاہری معنی سمجھے کہ کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی اور پریشان ہوگئی۔ جب آپؐ نے اس کا صحیح مفہوم بتایا تو بڑھیا کی پریشانی خوشی میں بدل گئی اور اُمت کو کلامِ نبی ﷺ کے فہم کا ایک اصول مل گیا۔

۞ ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ مجھے سواری کے لیے اونٹ چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا: ’’میں تجھے اونٹنی کا بچہ دوں گا‘‘۔ اُس شخص نے حیرت سے کہا: یارسول اللہؐ! اونٹنی کے بچے کا میں کیا کروں گا‘ وہ میرا بوجھ کیسے سنبھالے گا؟ مجھے تو آپؐ اُونٹ ہی دیجیے۔ جب وہ شخص زیادہ حیران ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ ’’اللہ کے بندے! ہم آپؐ کو اونٹ ہی دیں گے‘ وہ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا‘‘۔ یہ سن کر وہ شخص خوش ہوگیا۔ تعجب کے بعد اگر خوشی ملے تو وہ فراواں ہوجاتی ہے۔

۞ ایک انصاری عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھی۔ آپؐ نے اس کو فرمایا: جلدی سے جاؤ‘ تمہارے شوہر کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی جلدی سے اپنے شوہر کے پاس گئی۔ جب شوہر نے اسے اتنا گھبرایا ہوا دیکھا تو پوچھا بات کیا ہے جو تم اس قدر پریشان نظر آرہی ہو؟ کہنے لگی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ تمہاری آنکھوں میں سفیدی ہے۔ جب اس کے شوہر نے سنا تو بات سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ سفیدی کے ساتھ سیاہی بھی تو ہے اور سب لوگوں کی آنکھوں میں سفیدی تو ہوتی ہے۔ تب وہ سمجھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح اس کے ساتھ خوش طبعی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہنسی اور خوش ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ خوش طبعی کی بات کی اور بے تکلفی روا رکھی۔ دیکھئے اس مزاح میں خوش طبعی کا عنصر تو ہے مگر خلافِ واقعہ کوئی بات نہیں۔

قرآن مجید میں ہے کہ رمضان شریف میں سحری کا وقت اُس وقت تک ہے جب تک سفید ڈورا صبح ہونے کی وجہ سے سیاہ ڈورے سے الگ نہ نظر آئے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک سفید اور ایک سیاہ ڈورا اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور اُس وقت تک کھاتے پیتے رہے جب تک دونوں دھاگے ایک دوسرے سے الگ الگ نظر نہ آئے۔ اس طرح دن کی روشنی نمودار ہوگئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپؐ نے مسکراتے ہوئے عدی کو فرمایا: ''تمہارا تکیہ تو بہت لمبا چوڑا ہے'' کہ اس کے نیچے دن اور رات دونوں آ گئے۔ کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ ''خیط الابیض'' اور ''خیط الاسود'' کا مطلب سیاہ اور سفید دھاگے نہ تھا بلکہ اس سے مراد صبح صادق کا سفید خط اور رات کا سیاہ خط تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مزاح کے واقعات دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپس میں خوشگوار مزاح سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

۞ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اکٹھے کہیں جا رہے تھے۔ تینوں حضرات اس طرح چل رہے تھے کہ حضرت علیؓ دوسرے دو کے درمیان تھے۔ شیخین دراز قد تھے اور حضرت علیؓ کا قد چھوٹا تھا۔ دونوں کو مذاق سوجھا تو کہنے لگے: علی! تم تو ہم دونوں کے درمیان اس طرح ہو جیسے لَنَا کے درمیان نقطہ۔ حضرت علیؓ نے سنا تو کہنے لگے کہ ٹھیک ہے مگر یہ تو دیکھو اگر میں تمہارے درمیان سے نکل جاؤں تو تم لَا رہ جاؤ گے، یعنی میرے بغیر تمہاری حیثیت لَا کی طرح ہے جس کا معنی ہے کچھ نہیں۔ لَنَا کے درمیان میں سے نون ہٹا دیا جائے تو باقی لَا رہ جاتا ہے۔

۞ ایک دفعہ چند صحابہؓ ایک جگہ بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے۔ ان کو مذاق جو سوجھا تو جو بھی کھجور کھاتا وہ گٹھلی حضرت علیؓ کے سامنے رکھ دیتا۔ اس طرح ساری گٹھلیاں حضرت علیؓ کے سامنے اکٹھی ہوگئیں۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ لگتا ہے کہ ساری کھجوریں علی ہی کھا گئے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ ایسا نہیں، بلکہ لگتا ہے کہ تم سب گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا گئے ہو اور میں گٹھلیاں نکال کر کھا تا رہا ہوں۔

۞ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو آپؓ کو مذاق سوجھا تو کہنے لگے مجھے تو خالق خیر نے پیدا کیا ہے اور تجھے خالق شر نے۔ اس سے وہ یہ سمجھی کہ اگر مجھے خالق شر نے پیدا کیا ہے تو میں تو برائی ہی برائی ہوں۔ یہ سمجھ کر وہ رونے لگی۔ اس پر

حضرت عمرؓ نے ہنس کر کہا اللہ کی بندی خیر اور شر کا پیدا کرنے والا ایک ہی اللہ ہے۔ اُسی نے مجھے پیدا کیا اور اُسی نے تجھے پیدا کیا اور وہی ہر چیز کا خالق ہے' خالق دو نہیں ایک ہی ہے۔ اس پر وہ لڑکی ہنس پڑی۔

۞ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور جوتا باہر اتار گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد واپس ہوا تو وہاں جوتا نہ تھا۔ کسی یہودی نے اس کا جوتا چرا کر قریب کے کنیسہ میں رکھ دیا۔ وہ شخص اپنا جوتا اِدھر اُدھر تلاش کرتا ہوا کنیسہ کے اندر گیا تو وہاں اپنا جوتا پڑا ہوا دیکھا۔ اس پر جوتے کو مخاطب کر کے کہنے لگا: تیرا برا ہو' میں تو اسلام لایا مگر تو یہودی ہو گیا۔

۞ ایک نابینا کی شادی ہوئی۔ ایک دن اس کی بیوی نے اسے کہا: کاش تو میرا حسن و جمال اور گورا رنگ دیکھ سکتا! نابینا کو مذاق سوجھا' کہنے لگا: اگر تو ایسی ہی حسین ہوتی تو آنکھوں والے تجھے میرے لیے کیوں چھوڑتے!

۞ ایک شخص کسی کے ہاں مہمان ہوا' وہ وہاں چار دن رُکا۔ صاحب خانہ چار دن اسے بیل کا گوشت کھلاتا رہا۔ آخر مہمان میزبان سے کہنے لگا: لگتا ہے تمہارے بیل کی ذبح کے بعد کی زندگی اس کی طبعی عمر سے زیادہ لمبی ہے۔

۞ ایک شخص کو اپنے نوکر پر غصہ آیا۔ کہنے لگا میرا دل چاہتا ہے کہ تجھے ایسا تھپڑ رسید کروں کہ تو مدینہ جا کر گرے۔ نوکر نے برجستہ جواب دیا کہ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ایک تھپڑ اور ماریں تو مکہ پہنچ جاؤں اور حج کی سعادت حاصل کرلوں۔

سیرتِ طیبہؐ اور صحابہؓ کے مذکورہ واقعات کتب حدیث میں صحیح اسناد کے ساتھ ملتے ہیں' جبکہ قرونِ اولیٰ کے دوسرے لوگوں کے واقعات تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام روکھا پھیکا طرزِ زندگی نہیں سکھاتا' بلکہ تمام طبعی جذبات کے اظہار کی مناسب شرائط اور حدود و آداب کے ساتھ اجازت دیتا ہے۔

۞۞۞

رفتارِ کار

روداد تقریبِ تقسیم اَسناد

برائے ایک سالہ قرآن فہمی کورس ۰۷-۲۰۰۶ء

زیرِ اہتمام انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی

فاروق احمد

یہ احوال ہے انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کے تحت تیرہویں ایک سالہ قرآن فہمی کورس کی تقریبِ تقسیمِ اَسناد کا۔ اِس تقریب کی خصوصیات یہ تھیں کہ یہ پہلی بار قرآن اکیڈمی یاسین آباد میں منعقد ہوئی، پہلی بار تین مراکز سے کورس کرنے والے شرکاء شریکِ تقریب تھے اور پہلی بار تقریب کے مہمانِ خصوصی تھے صدر انجمن خدّام القرآن فیصل آباد جناب ڈاکٹر عبدالسمیع۔ پچھلے سال کی تقریب میں ایک طالب علم نے اپنے اِس تأثر کا اظہار کیا تھا کہ ''اگر آپ مجھ سے اِس کورس کا نظام الاوقات (time table) پوچھیں گے تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ پہلا پیریڈ قرآن، دوسرا پیریڈ قرآن، تیسرا پیریڈ قرآن، چوتھا پیریڈ قرآن۔ ہفتہ میں پانچ دن اور ہر دن کے چار گھنٹے، صرف قرآن کی تدریس''۔ اِس سال کی تقریب میں ایک طالب علم نے اپنا یہ تأثر بیان کیا کہ ''روشن خیالی اور اعتدال پسندی کا پُرفریب پرچار کرنے والوں کو ابھی اندازہ نہیں ہے کہ یہ کورس کیا ہے! بظاہر بہت دھیما اور ٹھنڈا، لیکن درحقیقت ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیش خیمہ۔ جب اِس کورس کی حقیقت سے مغرب پرست آگاہ ہوں گے تب تک کافی دیر ہو چکی ہوگی اور پھر روکا نہ جا سکے گا کسی سے یہ سیلِ رواں۔ اِن شاءاللہ!''

تقریب کا انعقاد بروز ہفتہ ۲۶ جنوری ۲۰۰۸ء صبح ۱۰:۱۵ بجے ہوا۔ میزبانی کے فرائض دو فارغ التحصیل طلبہ نے بحسن وخوبی ادا کیے۔ یہ تھے قرآن اکیڈمی ڈیفنس کے مفتی فیصل خورشید جاپان والا اور قرآن اکیڈمی یٰسین آباد کے فرقان احمد۔ تلاوتِ قرآن پاک کی سعادت گلستانِ جوہر مرکز کے طالب علم ریشائیل احمد نے حاصل کی اور ترجمہ قرآن اکیڈمی ڈیفنس کے محمد ابرار

نے بیان کیا۔

ڈائریکٹر اکیڈمکس جناب انجینئر نوید احمد نے ایک سالہ قرآن فہمی کورس کا پس منظر اور مقاصد بیان کیے۔اُنہوں نے کہا:

''وقت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اِس وقت دنیا میں دینِ اسلام مغلوب ہے اور اُمتِ مسلمہ بدترین زوال سے دوچار ہے۔قرآن فہمی کورس کا مقصد اسلام کو پھر سے زندہ کرنا ہے۔ارشادِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ جسے اس حال میں موت آئی کہ وہ علم حاصل کر رہا تھا تاکہ اُس کے ذریعے اسلام کو زندہ کرے تو اُس کے اور انبیاءؑ کے درمیان جنت میں ایک درجہ کا فرق ہوگا (دارمی' طبرانی)۔جس کرۂ ارضی پر ہم دینِ اسلام غالب کرنا چاہتے ہیں وہاں مغربی تہذیب کا ہمہ گیر غلبہ ہے۔اہلِ مغرب نے عالمِ اسلام پر پہلے عسکری و سیاسی غلبہ حاصل کیا اور پھر فکری غلبہ حاصل کرنے کے لئے اپنا تعلیمی نظام جاری کر دیا۔اِس نظامِ تعلیم میں مادہ پرستی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے' جس کے مظاہر یہ ہیں کہ خالق کے بجائے کائنات پر توجہ ہے' روح کے بجائے جسم سے بحث ہے اور آخرت کے بجائے حیاتِ دنیا کی فکر ہے۔ضرورت ہے کہ پھر سے اُمت میں ایمان ویقین پیدا کیا جائے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ''تم ہی غالب ہوگے بشرطیکہ مؤمن ہو''۔(آلِ عمران:۱۳۹)۔ایمان کے حصول کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ بقول مولانا ظفر علی خان:

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈھے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

بلاشبہ مدارس نے دین کو اصل صورت میں محفوظ رکھا لیکن اُن میں قرآن پر وہ توجہ نہیں جو ہونی چاہیے۔ضرورت اِس بات کی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن کی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ مبلغِ قرآن بن کر جہاد بالقرآن کریں' فکری اعتبار سے لوگوں کی اصلاح کریں' گمراہ کن نظریات کا توڑ کریں' دلوں میں ایمان و یقین پیدا کریں' عملی اعتبار سے تزکیۂ نفوس کا کام کریں اور تخلیقی یا تحقیقی کام کے ذریعے عصرِ حاضر میں اسلام کے نظامِ عدلِ اجتماعی کا خاکہ تیار کریں۔اِن مقاصد کے لیے انجمن خدام القرآن سندھ' کراچی کے تحت تیرہ (۱۳) ایک سالہ قرآن فہمی کورسز منعقد ہو چکے ہیں' جن سے ۶۵۰ سے زائد حضرات و خواتین استفادہ کر چکے ہیں۔۶۰ سے زائد حضرات و خواتین درس و تدریس اور تبلیغ کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔اِس سال تیرہواں کورس منعقد ہوا اور اِس کا انعقاد تین

مقامات پر ہوا' یعنی قرآن اکیڈمی ڈیفنس' قرآن اکیڈمی لیئین آباد اور گلستانِ جوہر مرکز۔ مجموعی طور پر تینوں مقامات پر ۲۵۰ حضرات وخواتین رجسٹرڈ ہوئے۔۱۳۴ نے کورس کے اختتام تک شرکت کی' جن میں ۷۸ حضرات اور ۵۶ خواتین تھیں۔۸۳ حضرات وخواتین نے امتحانات میں کامیابی حاصل کی 'جن میں ۴۶ حضرات اور ۳۷ خواتین تھیں۔بقیہ ۵۴ حضرات وخواتین کورس کے اختتام تک حاضر رہے''۔

ان کلمات کے بعد کورس کے فارغ التحصیل چھ طلبہ نے اپنے تاثرات پیش کیے۔

ڈیفنس اکیڈمی کے ایک طالب علم اور کراچی کے مایۂ ناز ماہرِ امراضِ سینہ جناب ڈاکٹر مصور انصاری نے کہا کہ اس وقت ہمارے دلوں میں قرآن فہمی کورس کے حوالے سے تشکر کے جو جذبات اُمڈ رہے ہیں وہ ایسے سمندر کی مانند محسوس ہو رہے ہیں جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اُنہوں نے شرکاء کے سامنے وقت کے مفید استعمال کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔اُنہوں نے کہا کہ وقت ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم سب کو امانت کے طور پر عطا فرمایا ہے اور اللہ اِس امانت کا ہم سے حساب لے گا۔اِس وقت ہمیں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وقت کو کیسے صرف کریں۔قرآن فہمی کورس میں شرکت نہ صرف وقت کا بہترین مصرف ہے بلکہ اِس کورس سے حاصل ہونے والی صلاحیت آئندہ کے لیے بھی وقت کے کارآمد استعمال کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ڈیفنس اکیڈمی کے ایک اور طالب علم مفتی فیصل خورشید جاپان والا نے کہا کہ وہ دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہیں اور مفتی تقی عثمانی صاحب کے معاون کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔اُنہیں ڈاکٹر اسرار احمد اور اُن کے کام سے متعلق اپنے بعض اساتذہ سے منفی تأثرات ملے تھے۔قرآن فہمی کورس میں اُن کی شرکت کا مقصد یہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے کام کے منفی پہلوؤں سے براہ راست آگاہی حاصل کریں اور عوام الناس کو اِن سے خبردار کرسکیں۔لیکن اِس کورس میں شرکت سے نتیجہ برعکس نکلا اور اُنہیں محسوس ہوا کہ علمائے کرام کو ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے چند مغالطے لاحق ہیں جو باہمی روابط سے دور کیے جاسکتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ اِن روابط کی کوشش کر رہے ہیں۔علماء کرام کا ڈاکٹر صاحب پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ کسی مدرسہ سے باقاعدہ فارغ التحصیل نہیں ہیں۔اُنہوں نے علماء کے سامنے یہ حقیقت رکھی کہ مفتی تقی عثمانی صاحب کے شیخ عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی بھی تو کسی مدرسہ سے فارغ التحصیل نہیں تھے۔تبلیغی جماعت کے کئی اکابرین کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔مفتی صاحب نے مزید فرمایا کہ اُنہوں نے ایک سالہ قرآن فہمی کورس میں جتنا قرآن پڑھا اتنا

دارالعلوم میں آٹھ سال میں نہیں پڑھا۔ مدارس کے نصاب میں ۵۰ فیصد فقہ، ۳۰ فیصد حدیث اور ۲۰ فیصد قرآنِ حکیم کا حصہ شامل ہے۔ قرآنِ حکیم کے حوالے سے صرف ''جلالین'' پڑھائی جاتی ہے جو عرب علماء کے نزدیک تفسیر نہیں بلکہ الفاظِ قرآنی کی وضاحت ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ وہ تبلیغی جماعت، جہادی گروپس اور تصوف کے حلقوں میں وقت لگا چکے ہیں۔ کہیں اُنہیں نبی اکرم ﷺ صرف ایک مبلغ کے طور پر نظر آئے، کہیں ایک مجاہد کے طور پر اور کہیں ایک مزکی کے طور پر۔ قرآن فہمی کورس میں جب اُنہوں نے منہج انقلابِ نبوی کو سمجھا تو اللہ کے رسول ﷺ کی جامع شخصیت کا نقشہ سامنے آیا اور میں نے اس منہج کی پیروی کے لیے تنظیمِ اسلامی میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔

قرآن اکیڈمی یاسین آباد سے کورس کی تکمیل کرنے والے جناب مشکور صاحب نے کہا کہ بظاہر بڑا عجیب معلوم ہوتا تھا کہ دس ماہ کے مختصر عرصے میں قرآنِ پاک کا ترجمہ کرنا آجائے گا، لیکن کورس کچھ اِس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ قرآنِ پاک کی آیات کو سمجھنا آسان ہوگیا ہے۔ کورس میں شرکت کا فوری ثمر یہ ملا کہ اِس سال رمضان المبارک میں تراویح کے دوران قرآنِ حکیم کی سماعت کی ایسی تأثیر محسوس ہوئی جو اِس سے پہلے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

قرآن اکیڈمی یاسین آباد کے دوسرے شریک حسین احمد مدنی نے کہا کہ قرآن اکیڈمیز انتہائی خاموشی سے گھاس کے اندر ہی اندر پانی پھیلا رہی ہیں اور جب باطل اِس کی طرف متوجہ ہوگا تو اِن شاء اللہ بہت دیر ہو چکی ہوگی اور انقلابی نظریات کی فصل جڑ پکڑ کر اِس طرح لہرا رہی ہوگی کہ اِسے اکھیڑنا ممکن نہ رہے گا۔

گلستان جوہر مرکز کے شریک جناب غلام مصطفیٰ بٹ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے۔ الفاظ کے مقابلے میں اُن کی آنکھوں سے بہنے والے شکر کے آنسو اور اُن کی رندھی آواز نے شرکاءِ محفل کے جذبات کو خوب جلا بخشی۔ اُنہوں نے کہا کہ کورس سے حاصل ہونے والی نعمت کی قدر یہ ہے کہ اب جو کچھ سیکھا ہے اِسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ وہ بذاتِ خود اِس کورس کے مختلف مضامین شام کے اوقات میں پڑھا رہے ہیں۔

گلستان جوہر مرکز کے دوسرے طالبِ علم جناب شاہد صاحب نے کہا کہ وہ عرصے تک مختلف مکاتبِ فکر کی مجالس میں شریک ہوتے رہے، لیکن کہیں بھی اطمینان نہ ہوا۔ قرآن فہمی کورس نے نہ صرف اُن کے اشکالات کا ازالہ کیا بلکہ اُن کے کئی سوالات کے تسلی بخش جوابات بھی فراہم کیے۔

دعوتِ خصوصی پر مدعو تنظیم اسلامی حلقہ سندھ زیریں کے ناظمِ دعوت جناب عامر خان نے سورۂ ابراہیم کی آیت ۷ کی روشنی میں قرآن فہمی کورس کے شرکاء کو اِس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ اللہ کی کتاب کا علم سیکھنا اللہ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ حدیثِ نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کے بارے میں خیر کا فیصلہ فرماتا ہے اُسے اپنے دین کا فہم عطا فرما دیتا ہے۔ اب اگر ہم نے اللہ کی اِس نعمت کی قدر کی اور اِسے اپنے عمل اور معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بنایا تو اللہ تعالیٰ اور نعمتیں عطا فرمائے گا۔ اس کے برعکس اگر ہم نے اِس نعمت کی ناشکری کی تو اللہ کی طرف سے شدید عذاب کا اندیشہ ہے۔

ڈپٹی اکیڈمک ڈائریکٹر جناب شجاع الدین شیخ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو علم سکھایا ہے‘ اب ہمیں خود کو اِس کا اہل ثابت کرنا ہے۔ قرآن فہمی کورس کی تکمیل کو علوم قرآن سیکھنے کے لیے ابتدا یعنی entrance سمجھیں۔ اب آپ عربی پڑھائیں اور تعلیماتِ قرآنی کے مطالعہ کے لیے حلقے قائم کریں‘ تا کہ کورس میں سیکھے ہوئے سبق کو نہ صرف یاد رکھ سکیں بلکہ مزید پختہ بھی کر سکیں۔

اِس کے بعد مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عبد السمیع صاحب نے فارغ التحصیل طلبہ میں اسناد تقسیم کیں۔ کورس میں آخر تک شریک رہنے والے حضرات کو سید اشفاق حسین صاحب‘ عامر خان صاحب اور انجینئر نوید احمد صاحب نے شرکت کی اَسناد دیں۔ خواتین میں ناظمۂ تنظیمِ اسلامی حلقۂ خواتین کراچی نے اسناد تقسیم کیں۔

آخر میں مہمانِ خصوصی ڈاکٹر عبد السمیع نے صدارتی خطاب ارشاد فرمایا۔ اُنہوں نے کامیاب شرکاء کو مبارک باد دی۔ اُنہوں نے شرکاء کو متوجہ کیا کہ دورِ حاضر میں فکرِ مغرب کا غلبہ اِس قدر ہمہ گیر ہے کہ ہم بھی اُس کے اثرات سے محفوظ نہیں۔ آج ہم اللہ کے کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے پہلے حکم کی حکمتیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بھی مادّہ پرستانہ ہے۔ ہمارے پیشِ نظر یہ حقیقت رہنی چاہیے کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور اُس کا ہر حکم ہم نے ہر صورت میں تسلیم کرنا ہے۔ جب اعتراض کرنے والوں نے کہا کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے تو جواب میں اللہ نے تجارت اور سود کے فرق کو واضح کرنے کے لیے کوئی نکات بیان نہیں کیے‘ بلکہ فرمایا کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔ اہمیت صرف اور صرف اللہ کے حکم کی ہے۔ آج کہا جاتا ہے کہ ہم سودی کاروبار چھوڑ دیں گے‘ لیکن پہلے آپ متبادل پیش

کیجیے۔ ایسے لوگوں سے میرا سوال ہے کہ اگر کسی خاتون کے لیے مناسب رشتہ نہ مل رہا ہو تو کیا بھائی اُس سے نکاح کر لے گا؟ کیا وہ کہے گا کہ متبادل نہیں مل رہا لہٰذا میں خود بہن سے نکاح کر رہا ہوں؟ عقل بھی کہتی ہے کہ یہ رشتہ زیادہ مناسب ہے۔ بھائی اپنی بہن کی عادات واطوار اور پسند و ناپسند کو کسی غیر سے زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہے۔ وہ ایسا صرف اِس لیے نہیں کرتا کہ اللہ نے بہن کا بھائی سے نکاح حرام کیا ہے۔ اِسی طرح سود کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ ایک ارشادِ نبویؐ کا مفہوم ہے کہ سود کے گناہ کے ستر وبال ہیں' اِن میں سے کم تر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ نکاح کر لے۔ گویا سود لینا ماں کے ساتھ نکاح سے بھی ستر گنا بڑا جرم ہے۔ اِسی طرح آج میڈیا پر حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی سچائی' امانت داری اور وعدے کی پاسداری کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ یاد رکھیے! ہم حضرت محمد ﷺ پر اِس لیے ایمان نہیں لائے کہ آپ ﷺ سچے' امانت دار اور ایفائے عہد کے پابند تھے' بلکہ ہم آپ ﷺ پر اِس حیثیت میں ایمان لائے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ کی رسالت کو نمایاں کرنا ہے جسے مغرب تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اُنہوں نے سینئر اساتذہ کو مشورہ دیا کہ وہ دورِ حاضر کے تازہ فتنوں کو سمجھنے اور اُن کے سدباب کے لیے زیادہ وقت صرف کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بھی دین کی خدمت کے لیے مغرب کی متعین کردہ راہوں پر چل پڑیں۔ اگر ایسا ہو گیا تو چاہے کچھ ہی کر لیں' ہم باطل ہی کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کی دعا سے تقریب کا اختتام ہوا۔

❁❁❁

جدید دنیائے اسلام

قسط وار سلسلہ (53)

سیرالیون

(SIERRA LEONE)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

سیرالیون : ایک نظر میں

سرکاری نام: جمہوریہ سیرالیون
صدر: احمد تیجان کبّاہ (1998ء)
رقبہ: 71 ہزار 740 مربع کلومیٹر
آبادی: 60 لاکھ
شرح افزائش: 2.3 فیصد
شرح پیدائش: 43.3 فی ہزار
گنجانی آبادی: 212 فی مربع میل
دارالحکومت: فری ٹاؤن (گیارہ لاکھ)
کرنسی: لیون
شرح خواندگی: 32 فیصد
مجموعی قومی پیداوار: 3.05 ارب ڈالر سالانہ
فی کس آمدنی: 500 ڈالر سالانہ
مذہب: مسلمان 60 فیصد، لامذہب 30 فیصد، عیسائی 10 فیصد
زبانیں: انگریزی (سرکاری)، منڈے، تامانی اور دوسری قبائلی بولیاں

نسلیں: مقامی افریقی قبائل، یورپی و ایشیائی مسلمان
قابل کاشت رقبہ: 7 فیصد
زراعت: کافی، کوکو، پام آئل، چاول، مونگ پھلی، پولٹری، مویشی، بھیڑ بکریاں، مچھلی
صنعت: ہیروں کی کان کنی، پٹرول کی صفائی، مشروبات، سگریٹ، پارچہ بافی، جوتے
معدنیات: ہیرے، کسائٹ، کچا لوہا
برآمدات: کل مالیت 49 ملین ڈالر (ہیرے، کوکو، کافی، مچھلی)
درآمدات: کل مالیت 264 ملین ڈالر (اشیائے خوردنی، مشینری، پرزہ جات، گاڑیاں)
تجارتی ساتھی: بلجیم، جرمنی، برطانیہ، ہالینڈ، امریکہ، آیوری کوسٹ، اٹلی

سیرالیون اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم کا رکن ہے۔ اس کا لفظی مطلب ہے: ''ببر شیروں کی پہاڑی''۔ یہ نام ایک پرتگالی ملاح پیڈرو ڈی سنٹارا نے 1460ء میں اس وجہ سے دیا تھا کہ اس کے ساحلی پہاڑوں پر بادلوں کی گرج سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شیر دھاڑ رہے ہوں۔

مغربی افریقہ میں واقع سیرالیون کے شمال مشرق میں گنی، جنوب مشرق میں لائبیریا اور مغرب میں بحراوقیانوس پھیلا ہوا ہے۔ سیرالیون کا مشرقی حصہ پہاڑی ہے جس میں کوہِ لوما کی بلندی سطح سمندر سے 1800 میٹر ہے۔ ملک کا عام ڈھلان مشرق سے مغرب کی جانب ہے۔ یہاں کے ساحلی علاقے نشیبی اور دلدلی ہیں جن میں آبی نباتات اُگی رہتی ہیں۔ لوہا، کرومائٹ اور ہیرے یہاں کی خاص معدنیات ہیں۔ ملک کے جنوب مشرقی حصے میں ہیرے پائے جاتے ہیں۔ لوہے اور کرومائٹ کی کانوں کو ریلوے لائن کے ذریعے فری ٹاؤن کی بندرگاہ سے منسلک کیا گیا ہے۔ ابھی تک ملک میں صنعتی ترقی ابتدائی مراحل میں ہے۔ زیادہ تر لوہا، کرومائٹ اور ہیرے برآمد کیے جاتے ہیں۔ دارالحکومت فری

ٹاؤن ایک قدرتی بندرگاہ ہے جو دریائے روکیل کے دہانے پر واقع ہے۔

سیرالیون شروع ہی سے بے شمار ریاستوں یا سرداریوں میں بٹا ہوا تھا۔ پرتگالی سیاح پیڈرو سنٹارا پہلی مرتبہ 1460ء میں اس کے ساحل پر اترا۔ اٹھارویں صدی تک یہ علاقہ اہل یورپ کے لیے غلاموں کے حصول کے لیے بہترین منڈی بن گیا۔

1787ء۔ برطانیہ سے آنے والے نوآزاد غلاموں کو آباد کرنے کے لیے ''فری ٹاؤن'' کے نام سے ایک بستی آباد کی گئی جو آج ملک کا دارالحکومت ہے۔

1808ء۔ فری ٹاؤن کو برطانیہ نے کراؤن کالونی بنالیا۔

1896ء۔ سیرالیون برطانیہ کے زیرانتداب آجاتا ہے۔

1924ء۔ نیا آئین نافذ کیا جاتا ہے تاکہ قبائل کے سرداروں پر مشتمل قانون ساز کونسل بنائی جا سکے' لیکن عوام الناس کو یہ آئین پسند نہ آیا۔

1943ء۔ عوام کے نمائندوں کو بھی قانون ساز کونسل میں کچھ نمائندگی دی جائے گی۔

1951ء۔ نیا آئین بنایا گیا' تاکہ آزادی کی راہ ہموار ہو سکے۔

1958ء۔ کونسل کی جگہ اسمبلی بنائی جاتی ہے' جس کے انتخابات میں پیپلز پارٹی اکثریت سے جیت جاتی ہے۔ ڈاکٹر ملٹن مارگئی وزیراعظم منتخب ہوتے ہیں۔

1961ء۔ سیرالیون ایک آزاد اور خودمختار مملکت کی حیثیت سے دولت مشترکہ کا رکن بنتا ہے۔

1964ء۔ وزیراعظم ڈاکٹر ملٹن کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اُن کے بھائی البرٹ کو گورنر جنرل کی جانب سے نئی حکومت بنانے کے لیے کہا جاتا ہے۔

1967ء۔ حزبِ اختلاف ''آل پیپلز کانگریس'' کے رہنما سیاکاسٹی وینس انتخابات میں جیت جاتے ہیں' وہ وزیراعظم منتخب ہوتے ہیں' لیکن آرمی چیف پُرامن فوجی انقلاب کے ذریعے انہیں برطرف کر دیتے ہیں۔ آئین معطل کر دیا جاتا ہے اور فوج اور پولیس کے اعلیٰ افسروں پر مشتمل ''نیشنل اصلاحی کونسل'' بنائی جاتی ہے۔

1968ء۔ فوج اور پولیس کے جونیئر افسر ایک اور فوجی انقلاب لاتے ہیں۔ اسمبلی کو بحال کرتے ہیں اور سیاکاسٹی وینس سے وزارت عظمیٰ کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی درخواست کرتے ہیں۔

1969ء۔ پیپلز کانگریس اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں ہار جاتی ہے۔

1971ء۔ آرمی کمانڈر بریگیڈئر جنرل جان بنگورا فوجی بغاوت کرتے ہیں' جسے کچل دیا جاتا ہے۔ وزیراعظم سیاکا باغیوں کو کچلنے کے لیے گنی سے فوجی امداد طلب کرتا ہے۔ سیرالیون کو جمہوریہ قرار دیا جاتا ہے۔

1973ء۔ حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش بروقت پکڑی جاتی ہے۔ سیرالیون کی فوجی طاقت میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ نئے انتخابات میں آل پیپلز کانگریس جیت جاتی ہے۔

1976ء۔صدر سیاکا دوسری مرتبہ صدر منتخب ہوتے ہیں۔

1978ء۔ نئے آئین کے تحت عہدۂ صدارت کی میعاد پانچ سال سے بڑھا کر سات سال کر دی جاتی ہے۔آل پیپلز کانگریس کو ملک کی واحد سیاسی جماعت قرار دیا جاتا ہے۔باقی سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔

1980ء۔ یورپ کی ایک فرم سے لوہے کی کانیں کھودنے کا معاہدہ ہوتا ہے۔زرعی پیداوار بڑھانے کی ہر ممکن تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

1985ء۔اگست کے انتخابات میں آل پیپلز کانگریس نے آئندہ سال کے لیے آرمی چیف میجر جنرل موماہ کا انتخاب کر لیا ہے اور یوں کسی خون خرابے کے بغیر اقتدار کی منتقلی عمل میں آئی۔میجر جنرل موماہ نے 81 سالہ صدر سیاکا سے صدارت کا چارج لیا۔

1992ء۔ فوج کے باغی سپاہیوں نے جنرل موماہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور کثیر جماعتی سیاسی حکومت کی طرف داری کی۔

1996ء۔ عام انتخابات میں پیپلز کانگریس کے امیدوار احمد تیجان کبّاہ جیت گئے اور یوں وہ پہلے منتخب جمہوری صدر مملکت بنے۔

1997ء۔مئی' لیفٹیننٹ کرنل جونی پال کورو مانے فوجی بغاوت کر کے صدر احمد کبّاہ کی سول حکومت کا خاتمہ کر دیا۔کورو مانے اپنے حریفوں کا قتل وقتال کیا اور ملک کی معاشی حالت کو تباہ کر دیا۔ دولتِ مشترکہ نے صدر احمد کبّاہ کی واپسی کا مطالبہ کیا۔نائیجیریا نے اس مطالبے کی حمایت میں اپنی فوج سیرالیون میں داخل کر دی۔

1998ء۔ 10 مارچ کو دس ماہ کی جلاوطنی کے بعد صدر احمد کبّاہ واپس سیرالیون آ گئے' لیکن باغی فوجیوں نے سرکشی جاری رکھی۔

1999ء۔ جولائی میں حکومت اور باغی ''انقلابی یونائیٹڈ فرنٹ'' کے درمیان معاہدہ ہوا' جس کے تحت دونوں فریقوں نے اقتدار میں مساویانہ شرکت کا اصول تسلیم کر لیا۔

2002ء۔ ملک میں صدارتی انتخابات ہوئے۔صدر احمد کبّاہ 70 فی صد زیادہ ووٹ لے کر دوبارہ صدر بن گئے۔

سیرالیون میں اگرچہ مسلمانوں کی اکثریت ہے اور وہ پوری آبادی کا 60 فیصد ہیں' اس کے باوجود ملک کی انتظامیہ پر عیسائی چھائے ہوئے ہیں' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کی کمی ہے' دوسرے یہ کہ ملک آزادی سے قبل برطانیہ کی غلامی میں رہا ہے اور وہاں اب تک سیاست' معیشت' حکومت' عدلیہ' انتظامیہ' دفاع' سب شعبے برطانیہ کے زیر اثر عیسائیوں کے کنٹرول میں ہیں۔تبلیغی جماعتوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مسلمانوں کی تعداد تو بڑھ رہی ہے اور اسلام مقامی قبائل میں اپنا اثر جما رہا ہے' لیکن مسلمانوں میں ابھی سچی بیداری اور غلامانہ روایات سے نجات پانے کا جذبہ پیدا نہیں ہوا ہے۔oo